ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ **ترجمان القرآن** لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل: ۵۳۴۰

جلد ۱۱۵ مئی ۱۹۹۱ء - شوال ۱۴۱۱ھ عدد ۳

رابطہ و ترسیلِ زر کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون نمبر: ۳۲۴۴۶۸ - ۶۸۶۳۶ پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

فی پرچہ: ۶ روپے زر سالانہ: ۶۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ہمارا اصل کام اور اساسی سرگرمی کا دائرہ دعوت الی اللہ ، دعوتِ حق ، دعوتِ دین ، دعوتِ اقامتِ دین ، دعوتِ ایمان مع الشعور والعلم اور دعوتِ وحدتِ فکر و عمل تھا ۔ یہ کام جسے دعوتِ حق یا دعوتِ دین کا مختصر عنوان دیا جا سکتا ہے ، قرآن میں اس کے لیے انبیاء علیہم السلام (خصوصاً حضور خاتم النبیینؐ) کے حوالے سے اس درجہ کے تصریف و تکرار سے تاکید شدید وارد ہے کہ جس کے رو سے کسی مسلمان فرد اور کسی مسلمان جماعت کا سب سے بڑا ، ہمہ گیر ، پوری زندگی پر حاوی ، کسی دور میں بھی ناقابلِ ترک ، مسلسل تگ و تاز اور قربانیوں اور تحملِ شدائد کا متقاضی عمل یہی ہے ۔ یہاں سینکڑوں میں سے چند مختصر آیات یا ان کے اقتباسات عرض ہیں :

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف - ۱۰۸)

" تم (اے نبیؐ) ، ان سے صاف کہہ دو کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں ، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی ! "

قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ - (الرعد - ۳۶)

" تم صاف صاف کہہ دو کہ مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤں ، لہٰذا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے " ۔

ـــــــ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (النحل-۱۲۵)

"اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو، حکمت سے اور عمدہ نصیحت سے، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو"

ـــــــ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ .... (حٰمٓ السجدہ-۳۳)

اور اس شخص کی بات سے بہتر کس کی بات ہو گی جو اللہ تعالیٰ کی طرف بلائے، نیک عمل کرے اور یہ کہے کہ میں مسلم ہوں۔

(۲)

اقامتِ دین کا نصب العین حاصل کر کے خوشنودیٔ باری تعالیٰ سے فیض یاب ہونے کے لیے دعوت کا یہ طریقِ کار اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ فرد فرد پہ کام ہو۔ کوئی مخالفت کرے، کوئی بحث و استدلال کا راستہ پسند کرے، کوئی کٹ حجتیاں کرے، کوئی تذبذب میں رہے، کوئی پوری طرح اسے قبول کر کے اپنی ذات سے فکر و عمل کا مکمل انقلاب شروع کر دے۔ کوئی تضحیک و استہزاء سے کام لے، کوئی جبر و تشدد کے ہتھکنڈے آزمائے، کوئی صاحبِ دعوت کے اندر سے تبدیلی پیدا کرنے کے لیے خوشامد اور لجاجت سے کام لے۔ کوئی تقاضا کرے کہ تم اپنی دعوت میں فلاں امر کو بھی شامل کرو، یا فلاں جز کو اس سے خارج کر دو، کوئی روپیہ پیسے کا لالچ دے، کوئی دوسری دنیوی خواہشات اور تفریحات و تعیشات کا لالچ دلائے، کوئی اپنی کچھ شرائط منوانا چاہے۔

اس طرح داعی الی اللہ اپنے ماحول کو بلو بلو کر مکھن کا ذرہ ذرہ حاصل کرتا ہے۔ اس کی ساری کوششیں یہ ہوتی ہیں کہ مکمل دینی فکر و عمل کو رضاکارانہ طور پر اختیار کرنے کے لیے ایک مقررہ معیار دین کے باشعور، مخلص اور فعال افراد دریافت ہوتے جائیں

تاکہ ان کے ذریعے ریت میں سے سونے کے ذرات تلاش کرنے کا کام مسلسل بڑھتا چلا جائے۔ یہ لوگ حنیف و یک آہنگ اور نفاق و تضاد سے پاک ہوں۔ اور قدم قدم پر ٹھٹک جانے والے اور تذبذب میں پڑ جانے والے نہ ہوں ۔۔۔ نیز معاشی تنگی اور دوسری مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے ہمت ہار نے والے اور مفاد اور خواہشات اور ماحول کے بے جا تقاضوں کے سامنے جھک جانے والے نہ ہوں۔ اُن کے آگے پیچھے طرح طرح کی تحریکیں اور ہنگامے اٹھتے رہیں۔ وہ ایک تو اپنا رُخ نہ بدلیں، اپنے اصول اور کردار اور متعین کردہ طریقِ کار کو نہ بدلیں، دوسروں کی غیر متعلق سرگرمیوں پر فدا نہ ہو جائیں اور ان کی موجوں میں نہ بہنے لگیں۔ نیز اپنا وقت اپنی دینی تحریک اور اس کے اساسی تقاضے (یعنی دعوتِ حق) کے بجائے دوسری دلچسپیوں میں نہ کھپائیں۔ چاہے بہت روپیہ ملتا ہو، شہرت حاصل ہوتی ہو، کسی دائرے میں چودھراہٹ کا مقام ملتا ہو۔ بھاری رقوم اور چندے بھی ملتے ہوں، ووٹ اور سیٹیں زیادہ حاصل ہوں۔

دوسری طرف ماحول ہوتا ہے جس کا ایک دائرہ گھر اور حکومت ہے۔ جبریت کے مختلف طریقے ہیں، ایک ذرائع ابلاغ ہیں، ایک جاگیردارانہ استکبار ہے، ایک سامراجیت ہے، ایک عالمی ڈپلومیسی اور پروپیگنڈے کی قسم قسم کی لہریں ہیں، متخالف قسم کا تہذیبی و ثقافتی تسلط ہے، طرح طرح عصبیتیں ہیں، رنگا رنگ فرقہ بندیاں ہیں، ادب کا جادو ہے اور روپے کے بت کی پوجا پاٹ ہے۔ عورت کو مئے آزادی کا مسموم مشروب پلا کر اُسے جدید ترین استحصال کے جال میں پھانسا جا رہا ہے، جرائم کا رقصِ خونیں زوروں پر ہے، رشوت و خیانت کی جونکیں ہر آدمی کے رگ گلو سے چمٹی ہوئی ہیں۔ خوف اور غم پیدا کرنے والے واقعات ہیں۔ جن کی لہریں دلوں پر ٹوٹی پڑ رہی ہیں۔ اس ماحول میں ہر داعیِ حق اور اس سے اثر پذیر ہونے والا نو خیز بندۂ حق شدید قسم کی مقناطیسی کششوں اور حزن کی برقی لہروں کے درمیان ایسی بڑی کشمکش سے دوچار ہوتا ہے اور یہ عالم عمر بھر جاری رہتا ہے کہ صرف مضبوط

ایمان، زندہ ضمیر، روشن شعور اور استقامتی کردار والے لوگ ہی اس وقت تک کھڑے رہ سکتے ہیں جب تک وہ اپنے اندرون اور بیرون کے مدوجزر احوال کی نگرانی کریں اور اپنے مقام پر قدمِ ثبات جما کر مستقلاً قائم رہیں۔

ورنہ کسی بھی ملے روپے کی کھنک، نگاہ کی لغزش، حرام کی کشش، عہدوں کی طلب خدا کی راہ میں قربانیاں دینے والوں کو روحانی تباہی کے کسی گرداب میں غرق کردیتی ہیں۔

عقیدوں اور نظریوں میں لچک پیدا کرلینا، اضطرار کے بہانے سے ناجائز کو جائز کرلینا، بڑی برائی کے معاملے میں چھوٹی برائی کے نظریے کے تحت ہمیشہ کسی نہ کسی برائی کا انتخاب کرنا اور کامل اجتناب کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مارنا، تبدیلیٔ وقت اور رواجِ زمانہ کو دلیل و حجت بنا لینا، انتہائی غور و فکر سے طے کردہ حدود کو توڑ دینا، اپنے آپ کو روزی کمانے کی اتنی وسیع سرگرمیوں میں لگا لینا کہ دعوتِ حق کا کام ثانوی اور ضمنی حیثیت اختیار کرجائے، حکومت کے تیور دیکھ کے سہم جانا۔ کسی عالمی سامراجی قوت کی برہمی کے نتائج سے خوف کھا کر تصورات میں لچک پیدا کرلینا، اور راہِ عمل یا رفتارِ کار میں آہستہ آہستہ تبدیلی پیدا کرلینا، اپنے خاص خاص اسالیب اور اقدار و روایات پر برسوں کاربند رہنے کے بعد کسی شرعی تقاضے کے بغیر (اور دین و ملّتِ اسلامیہ کی کسی اہم اور واضح مصلحت کے بغیر) ترک کرکے ایسے نئے انداز اختیار کرلینا کہ متاثر لوگ حیران رہ جائیں بلکہ ان کا جو اعتماد قائم ہوا ہو وہ درہم برہم ہوجائے ـــــ ماحول کے پاس ایسے کتنے ہی مقاماتِ لغزش ہیں۔ شیطان ہر شخص کے ساتھ اس مقصد سے موجود ہے کہ وہ غلطی اور برائی اور کجروی کو خوشنما بنا کے پیش کرے۔

کتنا سخت امتحان ہے؟ داعیٔ حق کے لیے زندگی گویا ایک پُل صراط کی مانند ہے کہ سیدھا چلے تو سلامت، اور اِدھر اُدھر گھومے تو آگ ہی آگ!

خدا کے دین کا کام وہی کرسکتا ہے جو اس امتحان کی حقیقت کو سمجھ لے اور سچے دل سے اس سے عہدہ برآ ہونے کا عزم کرے، نیز ہر نئے متاثرِ دعوت کو بھی اس بات کے لیے تیار کرے کہ وہ حق کی ہدایت اور رسولؐ کے اسوہ کے

مطابق دین کا کام کرے گا اور مزاحمت و ترغیبات کی تباہ کن قوتوں سے بچے گا۔

دعوتِ حق کا کام دراصل کسان کے کام سے مکمل طور پر مشابہ ہے۔ کسان پہلے ایک محدود و مخصوص قطعۂ زمین میں جانفشانی کرتا ہے۔ کھیت کو ہموار کرتا ہے، بڑی بوٹیوں اور سرکنڈوں اور جھڑبیریوں کو ایک ایک کر کے اکھیڑتا ہے۔ پھر اس کی مینڈیں اور حدیں درست کرتا ہے، پھر کئی کئی بار ہل چلاتا اور سہاگہ پھیرتا ہے کاشت کے موسم اور بارش کا انتظار کرتا ہے۔ یا مناسب وقت پر آبپاشی کرتا ہے، پھر جب مٹی کی ضرورت سے زیادہ گیلاہٹ دور ہو جاتی ہے تو زمین کو بیج ڈالنے کے لیے تیار کرتا ہے، پھر جب وہ بیج ڈالتا ہے تو ایک ایک دانے سے ہزار دانوں کی اُمیدیں لگا کر ڈالتا ہے۔ پھر فصل جب پہلی کونپلیں اور سوئیاں نکال کر زمین کی تاریکی کے پردے سے سر باہر نکالتی ہے تو ہر پودا اُسے اولاد کی طرح پیارا لگتا ہے، وہ اس کی بڑھوتری کو روز دیکھتا ہے۔ اس کی نگرانی کرتا ہے، اس کے گرد باڑھ لگاتا ہے۔ صبح و شام چکر لگا کر اطمینان حاصل کرتا ہے کہ کوئی ہرج مرج تو نہیں۔ موسم، ہوائیں، گھٹائیں، بجلیاں، آندھیاں، بارش کے تیز جھالے، اولے، یہ سب اُس کی فصل پر اثر انداز ہوتے ہیں، جنگلی جانور اور اپنے مولشی اور آس پاس سے گزرنے والے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کسان کی محنت کو برباد کرنے والے پکے دشمن ہوتے ہیں۔ ان سے بچاؤ کے لیے وہ کبھی تو بُتے کھڑے کرتا ہے، کبھی کُتے پالتا ہے۔ کبھی آس پاس گھات لگا کے بیٹھتا ہے۔ پھر کچھ دشمن کھیت کے اندر ہوتے ہیں اور فصل بڑھنے کے ساتھ ساتھ زور پکڑتے جاتے ہیں۔ مثلاً پوہلی، پیازی، ہرن کھُری، گوکھرو وغیرہ قسم کی بوٹیاں اور بیلیں۔ ان کو تلف کرنے کے لیے نلائی، گوڈائی کا کام ہاتھوں سے یا آلاتِ جدیدہ کی مدد سے کرنا ہوتا ہے۔ انھیں تلف نہ کیا جائے تو فصل کے حصے کی خوراک (کھاد پانی) کا بڑا حصہ یہ طفیلی پودے

لے اڑیں - دوسری آفت چوہوں، کیڑوں، مکوڑوں، سنڈیوں ٹڈوں اور جوؤں کی ہوتی ہے، جو پودوں کو چٹ بھی کرتی ہے اور طرح طرح کی بیماریوں میں بتلا کرتی ہے۔ اور مستقل طور پر کھیت کو خطرناک بنا دیتی ہے۔ اس حملہ آور لشکر سے فصل کو بچانے کے لیے کیمیکل ادویہ کو بطور اسلحہ استعمال کرنا ہوتا ہے۔ ایک آفت ٹڈی دل کی ہوتی ہے کہ جو اگر ٹوٹ پڑے تو نباتات کو، خصوصاً سرسبز فصلوں کو وہ ایک رات میں ایسے چٹ کر جاتی ہے کہ ایکڑوں رقبہ سپاٹ ہو جاتا ہے۔

ان آفات کے حملوں کی بوچھاڑوں کے درمیان کسان جوانمردی سے اپنی جدوجہد جاری رکھتا ہے۔ اور اگر دس سال کے اوسط حاصل کو دیکھا جائے تو وہ متوقع پیداوار کا ۵، ۷ فی صد گنوا دیتا ہے، بقیہ کو بچا لے جاتا ہے۔

کسان کا یہ کام ہوتا رہے تو آٹا کی ملوں سے آٹا ملتا رہے گا۔ اور کپڑے کے کارخانوں سے کپڑا ملتا رہے گا۔ اسی طرح کھانے کے تیل، مختلف سبزیاں اور پھل مارکیٹوں میں دستیاب رہیں گے۔ نیز دودھ، دہی، مکھن، انڈے سب کچھ مہیا ہوتے رہیں گے، مٹھائیاں اور بسکٹ بنتے رہیں گے۔

لیکن اگر کسانوں کی کوئی پاگل نسل پیدا ہو جائے تو وہ جب یہ مشاہدہ کرے گی کہ آٹا اور کپڑا مشینوں سے مل رہا ہے۔ باقی ساری چیزیں تیار بر تیار مارکیٹ سے دستیاب ہیں تو پھر اتنی جانفشانی کا ہے کے لیے کہ آدمی مٹی میں مل کر مٹی ہو جائے۔ اس خیال سے یہ پاگل کسان یہ تحریک چلا دیتے ہیں کہ ہم سب کو چاہیے کہ ہم اتنی بھاری محنت میں جی جان نہ گھلائیں۔ اور کارخانوں سے اور مارکیٹوں سے ضرورت کی اشیاء حاصل کریں۔ اور ذرا زیادہ وسیع اور بڑے کاموں کی طرف متوجہ ہوں۔

ان حواس باختہ کسانوں کو دو ایک سال گذارنے کے بعد اندازہ ہو جاتا ہے کہ معیشت کی ساری مشین رک گئی ہے۔ اور سائنس کے شعبدے اور ایجادیں اور دیوقامت مشینیں بدحالی کا سوگ منا رہی ہیں۔

اِس مثال سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سارے بڑے بڑے کاموں اور

اُونچے اُونچے اداروں کا دار و مدار دعوتِ حق کے اُس شیدائی اور راشد ضروری کام پر ہے جس کے لیے انبیا، و صُلحا نے زندگیاں کھپا دیں - بارہا ان کی فصلیں اُجڑیں، بارہا دشمنوں نے ان کا صفایا کر دیا - لیکن وہ از سرِ نو اسی کام میں لگ گئے - بعض نے برسوں کی محنت سے سو پچاس پودے خیر و خوبی کے پروان چڑھا لیے، بعض کا حاصل اس سے بھی کم رہا ہو - اور بعض کی فصل ایسی لہلہائی کہ یَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ کا سماں پیدا ہو گیا - یہی فصل ہے جس کا پھل ہر خدائی کسان کو آخرت میں میزان پہ تل کر ملے گا۔

ہم جماعت اسلامی کے لوگوں کو پہلے دن سے یہ درس دیا گیا تھا کہ یہاں پروگرام کسان کے سے کام کا ہے - محنت سے معاشرے کے اندر ہر شخص کو کوئی کھیتی تیار کرنی ہے، پھر زمین کو بنانا ہے، پھر ایک ایک بیج اُس شان کا بونا ہے جس کے لیے قرآن میں ہے کہ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ - کلمہ طیبہ کا بیج بو کر ایک ایک فرد کے سینے سے ایمان و کردار کا شجرہ طیبہ اُگا دکھانا ــــ یہ ہے اصل کام!

ہمیں تلقین کی گئی تھی کہ کسی حال میں بھی اس کام کو کمزور نہ ہونے دینا، کسی حال میں یہ نہ سوچنا کہ کتنے پودے اُگیں گے؟ کتنے پروان چڑھیں گے؟ کتنی بالیں اُٹھیں یا خوشے لائیں گے اور ان کا کیا مول ملے گا اور ہماری محنتوں کا محنتانہ بھی وصول ہو گا یا نہیں؟ یہ معاملات اللہ تعالیٰ سے متعلق ہیں جس کی ہم رعیت اور ملازم ہیں اور جس کے بتائے ہوئے طریق پر ہمیں انسانی دل و دماغ میں کلمہ طیبہ یا دعوتِ حق کی کاشتکاری کا کام کرنا ہے - اس بے لوث عبادت و خدمت کا اصل پھل اور اس کی پوری اُجرت آخرت میں ہمیں ملنی ہے، جس کا ہم سے وعدہ کیا گیا ہے - اس اہم کام کے لیے ہمیں دوسری ذاتی دلچسپیاں اور ترقیوں کے لالچ اور خواہشات کے رنگین خواب اور دولت و شہرت کے منصوبے یکسر ترک کرنے ہوں گے تاکہ ہم

پوری توجہ اس پر صرف کرسکیں - رزق کفاف پہ اکتفا لازم ہوگی - اور ہر کسی کو راہِ حق میں حسبِ مقدرت انفاق کرنا ہوگا -

ٹھیک ہے کہ تم دفتر بھی چلاؤ، اتحاد بھی بناؤ، انتخابی سرگرمی میں بھی حصہ لو، پارلیمانی دائرے میں بھی قدم رکھو، مگر ان سارے دائروں میں بھی اصل مطلوب غلبۂ دعوتِ حق ہونا چاہیے -

ہمارا نظریہ یہ بھی ضرور ہے کہ نیچے سے بھرپور طور پر دعوت کا کام ہوتا رہے تو اس کے ساتھ اگر اوپر کی سیاسی سطح سے بھی کوئی مدد ملے یا ہم کسی مزاحم یا مخالف قوت کا زور دلائل سے قومی ایوان میں توڑ سکیں تو مفید ہوگا - مگر اس فارمولے کو اگر یوں بدل لیا جائے کہ اقامتِ دین کا کام تو بس اوپر ہی سے ہوگا، نیچے کسی شست رفتار سرگرمی کی ضرورت نہیں تو اوپر سے ہونے والا کام یا تو بے کار ہو جائے گا یا بالکل بگڑ جائے گا۔[1] پس ہم میں سے ہر شخص کو کسان والا دعوتی کام پوری محنت سے کرنا چاہیے -

---

بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس سے بھی آگے جاکر یہ نظریہ کسی کسی دماغ میں کروٹ لے رہا ہے کہ ہماری تحریک اقامتِ دین مدت سے بڑی شست رفتاری سے محدود طور پر کام کر رہی ہے، لہٰذا ایک تو ہمیں کسان والے دعوتی کام کو چھوڑ کر جلسوں جلوسوں اور ریلیوں کے ذریعے کام کرنا چاہیے - اور دوسرے ہمیں

---

[1] اسی سبب سے قراردادِ مقاصد کے عملی دفعہ بن جانے اور متعدد دوسرے دینی امور کے جامۂ دستور و قانون پہن لینے کے باوجود عملاً کچھ نہ ہو سکا - یہی حال رہا تو شریعت بل بھی کچھ قانونی و دفتری و عدالتی پیرایوں پر اثر انداز ہونے کے باوجود اسلامی معاشرہ پیدا نہ کر سکے گا -

بین الاقوامی سطح پر ڈپلومیٹک سرگرمیوں میں حصہ لے کر اور سامراجی اکابر اور مسلم سربراہان مملکت کی باہمی کشمکش میں شریک ہو کر[1] ایک وسیع آفاقی سلسلہ کار شروع کرنا چاہیے۔ اس نظریے کے تحت ضروری ہے کہ ہم بین الاقوامی اور بین الاسلامی معاملات میں صرف سنجیدہ و متوازن طور پر خاص موقعوں پر موافقانہ اور مخالفانہ یا احتجاجی رائے ہی نہ دیں اور مصیبت کے موقعوں پر اخلاقی، مالی یا غذائی یا ادویاتی امداد ہی نہ پہنچائیں۔ بلکہ کسی کی حمایت اور کسی کی مذمت میں ایسا شدید اور مسلسل طوفان اٹھا دیں، گویا ہمارا اصل کام ہی یہی ہے۔ دعوت دینے کا بنیادی کام تو بچوں کا کھیل تھا جس کا دور گذر گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ راجعون۔

اوّل روز سے تحریک اسلامی کے لیے ہماری طے شدہ پالیسی یہ تھی اور بلا انقطاع اب تک جاری رہی کہ ہماری اصل فکری و انقلابی کشمکش کا دائرہ ہمارا اپنا معاشرہ ہے جب اسے اسلامی اصولوں پر ڈھالنے کا کام ہم کر چکیں گے اور اس سلسلے کی مزاحم قوتوں اور سیکولرازم اور منافقت کے اُن علمبرداروں کا زور توڑ چکیں گے جو بظاہر جمہوریت کا ڈراما رچا کر عوام کی اکثریت کا استحصال کر کے، اور دماغوں اور ضمیروں کو جبر و مکر کے ہتھکنڈوں سے مسخ کر کے، غیر اسلامی تہذیب و ثقافت اور مخالفِ ملت قانون و تعلیم کے نظاموں کو ٹھونستا یا جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مرحلہ آئے گا کہ ہم اپنے معاشرے سے باہر کسی معاشرے کے لوگوں میں خود وہاں کے

---

[1] یہ سانپوں سے نہیں بلکہ شیروں اور ہاتھیوں سے کھیلنے کا خوفناک معاملہ ہے۔ بالعموم تمام تر اور خصوصاً سامراجی ممالک کے سربراہ آپ کو کئی طریقوں سے خوش کرنے کے بعد بڑی خوب صورتی سے اپنا بھی کوئی مطالبہ ایسا پیش کر سکتے ہیں جس کا تعلق ملک یا عالمِ اسلام یا جماعت سے ہو۔ پھر نہ جانے رفتن، نہ جانے ماندن والی صورت پیدا ہو جائے۔ اسی لیے ہمارے اسلاف خود مسلمان سلاطین سے دُور دُور رہتے تھے۔

لوگوں کے ذریعے دعوتِ حق کا تعلیمی کام شروع کرکے اور پہلے سے ہو رہا ہو تو اُسے ایک مضبوط قوت میں بدل کر یہ تمنا کریں کہ کسی اور جگہ بھی ویسی ہی انقلابی کشمکش کا عمل فطری طور پر جاری ہو جائے۔

اِس سے پہلے ہمارا راستہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ بین الاقوامی یا بین الانسانی سطح پر کچھ قیادتوں اور طبقوں کے خلاف براہِ راست اعلانِ جنگ کر دیں یا ان کو چیلنج کریں یا حصولِ مقصد کے لیے کسی کی غالیانہ حمایت کا ایک سلسلہ شروع کر دیں۔ اس سے آگے چل کر یہ تو بہت ہی خطرناک سلسلہ ہے کہ ہم مختلف معاشروں کی موجودہ ہیئتِ سیاسیہ پر ہی نہیں، ان کے حکمرانوں اور لیڈروں کے خلاف گھٹیا درجے کی ذاتی عیب چینی کریں۔ اور فتوے لگانے شروع کر دیں۔ اچھے اور برے کے معیارات بھی درست استعمال نہ کریں۔ اور کریں بھی تو بیرونی معاشروں میں تبدیلی کے لیے بے چینی پیدا کر کے کوئی ایسا راستہ بنا کے دینے پر قادر نہ ہوں، جس کے نتیجے میں پہلے سے بہتر ربابِ اقتدار و اصحابِ قیادت جگہ لے سکیں۔ بلکہ دوسرے معاشروں کے عوام اور حکمرانوں اور قائدوں میں ایسی پریشانی ڈال دیں کہ جو نظام وہاں چل رہا ہے، اس میں بھی ضرر رساں خلل واقع ہونے لگے۔

جس کھیتی کا بہ طور کسان ہم نے چارج ہی نہیں لیا، جس کی مٹی، جس کے موسم، جس کی پیداواروں، جس کے نظامِ آبپاشی، جس کی ضرر رساں قوتوں اور ان پر قابو پانے کے حالات و معلومات ہی ہم نہیں رکھتے، اس کے معاملات میں محتاط حدوں سے بڑھتی ہوئی مداخلت کیوں؟

ہماری سابق پالیسی یہ چلی آ رہی ہے کہ اپنے معاشرے میں کشمکش کرتے ہوئے ہم بیرونی دنیا کے جس حصے سے بھی کوئی قوت یا تعاون یا حسنِ تعلقات اور جہاں عمومی علمی دعوت کے جاری رکھنے کے کچھ موافق حالات ہم پالیں، اُن کے بل پر اپنے کام کو مضبوط کریں۔ نہ یہ کہ اسلامی یا عام انسانی طاقتوں کو ہم کسا کسا کر اپنے خلاف متحرک کرتے رہیں۔ اور جو سہولتیں کہیں حاصل ہوں اُن کو ضائع کر دیں۔

پھر سوال یہ بھی ہے کہ جب خود اپنے ہی معاشرے کے حالات پہلے سے دسیوں گنا زیادہ ابتر ہوں، حتیٰ کہ ہم خود اپنے گھروں اور اپنے بچوں، بلکہ خود اپنی شخصیتوں کو کامل طور پر پورے اسلام کے حوالے نہ کر سکے ہوں تو پھر بات تو وہی ہوتی کہ:

تو کار زمین را نکو ساختی

کہ بر آسمان نیز پرداختی

اپنے معاشرے کا یہ حال ہے کہ علمی، تعلیمی، اقتصادی، اخلاقی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ہر لحاظ سے ہمارا اگراف تیزی سے پستی کی طرف جا رہا ہے۔ جرائم کی نہ صرف رفتار شدید تیز ہو گئی ہے، بلکہ ان میں گھناؤنا پن اور وحشیانہ پن آ گیا ہے خاص طور پر انسانی اور اسلامی ہر قدر اور تقاضے کو انسان نما بہائم نے غلاظت آلود قدموں سے کچلنا اپنے لیے لازم ٹھہرا لیا ہے۔ سال دو سال کے تمام بڑے بڑے قتل، اغوا، قومی دولت کی لوٹ مار، محافظینِ امن اور منتظمینِ ادارہ ہائے قومی کی طرف سے قانون سے مذاق، مجرموں کی سرپرستی اور رشوت و خیانت کے اذیت ناک کارنامے، شریف ترین شہریوں سے پولیس کا دردناک اور شرمناک سلوک اور ان کے منفرد ڈگری کے طریقہ ہائے تفتیش، ان سارے حالات کو دیکھیے، علماء کے فرقوں میں تفرقہ بازوں کو دیکھیے، جاگیرداروں کے کارنامے ملاحظہ کیجیے، غیر اسلامی عصبیتوں کی ننگی تلواریں ہر طرف چمکتی دیکھیے، اسلام کو جس طرح اس مُلک کے کارپردازوں نے ۴۴ برس تک فٹ بال بنائے رکھا ہے اس کا توہین آمیز منظر ملاحظہ کیجیے، قومی زبان اُردو کو صوبائی اور انگریزی زبان سے بنے ہوئے پلاس کے جبڑوں میں رکھ کر کچلے جاتے ہوئے ملاحظہ فرمایئے۔ ثقافت کے روز بروز بڑھتے چونچلوں کو دیکھیے، ہر روز عصمتوں کی "تاراجی" کے شائع ہونے والے واقعات ہی کی گنتی کر دیکھیے، بینکوں، گاڑیوں اور ریلوں کی ڈکیتیوں کے واقعات کا فلم نگاہوں سے گذاریے۔ اعلیٰ ضیافتوں میں کھانوں پر وحشیانہ طور پر لوٹ پڑنے کے ڈرامے دیکھیے، ـــــ پھر سوچیے کہ ان حالات میں کیا اسلام محض اُوپر سے عوام کے سینوں میں قانون کی چھینی سے اُتارا جا سکتا ہے، یا کیا وسیع

عالمی ڈپلومیسی کی شطرنج میں شرکت کرنے سے یہ خواب پورا ہو سکتا ہے۔

آنکھیں کھول کر حالات کو دیکھیے۔ ان وحشیانہ حالات کو سوائے اس کے بدلنے کی کیا تدبیر ہے کہ دُور دراز کی پُرشکوہ دلچسپیوں کو چھوڑ کر ایک ایک فرد کو صحیح عقیدے قبول کرنے اور تمام معاملات پر ٹھنڈے طریق سے اسلامی نقطۂ نظر کے تحت غور کرنے کا عادی بنایا جائے۔ اور پھر اُن پر خوفِ خدا کی اسپرٹ کے ساتھ عمل کرنے کی تربیت دی جائے۔

انسانی اخلاق و کردار اور سوچنے کے زاویوں اور خیر و شر کے پیمانوں اور نقشۂ عادات و اطوار کو بدلنے کا اور کوئی طریقہ انسانیت دریافت نہیں کر سکی۔ یہ تو اسلامی شعور دلانے کے لیے تعلیمِ بالغاں اور تربیتِ بالغاں کا ایک کام ہے۔ ہنگامہ و غوغا جتنا بڑھے گا، یہ مہم کمزور ہوتی جائے گی۔ اور زیرِ دعوت اور محوِ دعوت کارکنوں کو جتنا زیادہ پُرسکون اور سنجیدہ ماحول فراہم کیا جائے گا، اتنا ہی تعمیرِ انسانیت کا بنیادی کام زور پکڑے گا۔ دعوت جو خدا کی عبادت اور اس کے بندوں کے لیے خیرخواہی و خدمت کی جامع ہے، اسے نہ صرف بحال رہنا چاہیے بلکہ ہر قسم کے حالات میں اسے روز افزوں پھیلاؤ اختیار کرنا چاہیے۔ یہ بغیر کسان کی سی محنت کے ممکن نہیں۔

ہجومی اور غوغائی سیاست جتنی بڑھے گی اور بین الاقوامی قوتوں سے ڈپلومیٹک سلسلۂ موافقت و مخالفت جتنا پُرکشش ہوتا جائے گا، انسانوں کی اسلامی تعلیم اور اخلاقی تزکیہ کا کام اتنا ہی غیر اہم اور غیر دلچسپ ہوتا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں اپنے معاشرے کی تخریبی قوتیں اور زور پکڑتی جائیں گی اور ہم مسلسل سکڑتے اور بھنچتے چلے جائیں گے۔

ایک خاص مسئلہ یہ ہے کہ اگر بگڑتے ہوئے ماحول میں دعوت الی الحق اور دعوتِ اقامتِ دین کا کام نہ کیا جائے اور اس کام کے ضروری سرمائے کے طور پر علم و مطالعہ اور خدمت و کردار کو اپنے اندر اور اپنے گھر کے اندر مہیا نہ کیا جائے تو پھر خود اپنے آپ کو بھی بگاڑ

کی تند لہروں سے بچنا ممکن نہیں رہتا۔ فتنہ کی بھڑکتی ہوئی اور بڑھتی ہوئی آگ کی روک تھام کا کوئی امکان، سوائے تعلیم و تلقینِ دین اور اس کے ذریعے صلاح و فلاحِ معاشرہ کی مہم جاری رکھے بغیر نہیں ہے۔ جو داعی جتنا ڈھیلا پڑے گا، اتنا ہی اس کے خیالات اور رویوں اور معیارات اور دلچسپیوں میں فساد گھس آئے گا۔ اور اس کے ساتھ اس کے گھر، اس کے حلقہ ہائے ربط اور اس کے ادارے میں بھی جڑ پکڑے گا۔ یہاں تک کہ ایسا آدمی تحریکی دائرے میں اس چھوت کو دوسروں تک پہنچا کر اور زیادہ تباہی پیدا کردے گا۔ یعنی افراد کی کمزوریاں اجتماعیت کو روگ لگا دیں گی۔

لہٰذا تحریکِ اسلامی کے لیے کوئی بھی نتیجہ خیز بجز اس صورت کے نہیں ہو سکتا کہ بنیادی دعوت کے ذریعے ایمان، تنظیم اور تزکیہ کی مہم ہر دور میں، ہر قسم کے حالات میں، ہر دائرے میں پوری اہمیت اور زور کے ساتھ جاری رکھی جائے۔ جہاں اس میں کمی آئی، قلعۂ تحریک کی فصیل میں دراڑیں پڑنا شروع ہو جائیں گی۔

ایک بار خدا کا نام لے کر، داعیِ اقامتِ دین بن کر شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ کا منصب سنبھال کر، اس کا عہد یا اعلان یا مظاہرہ کر کے، طاغوت شکن انقلاب کے راستے پر قدم بڑھا دینا آدمی پر بہت بھاری بارِ امانت لاد دیتا ہے۔ اس محاذ کے سپاہیوں میں سے اگر کوئی ضعف و استکانت دکھائے یا پیٹھ موڑے تو وہ تقریباً ویسے ہی جرم کا مجرم ہوتا ہے۔ جیسے قتال فی سبیل اللہ کی صفوں سے فرار۔

آج جسے اسلام عزیز ہے اور جو پاکستان میں اس کو سربلند کرنا چاہتا ہے، اس کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ اسلام کے پیروکار اور اسلام کے بے لوث علمبردار پیدا کرنے کی وہ پیغمبرانہ مہم شروع کر دے جس کی مثال کسان کے کام سے ملتی ہے۔ یہ کام نہ ہو یا بھرپور طور پر نہ ہو تو باقی سب بیکار۔

انسانیت کے سچے خیرخواہ، ملتِ اسلامیہ کے حقیقی خادم اور پاکستان کے تحفظ و استحکام کے پاسدار اور معاشرے کی صلاح و فلاح اور بین الاقوامی دائروں میں گہری اثر اندازی کرنے والے لوگ وہی ہو سکتے ہیں جو کشتِ تاریخ کے اپنے اپنے حصے کے

قطعوں میں دعوتِ حق کے لیے کشادرزی اور تخم ریزی کا کام محنت وصبر سے کر سکیں۔

ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کام کو ایک ایک فرد اپنی اپنی سوچ اور اپنے اپنے علم اور اپنے اپنے ذرائع کے مطابق الگ الگ صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتا۔ اس کام کے لیے اجتماعیت ضروری ہے۔ بہت سے کاشت کارانِ حق مل جل کر اپنے معاشرے کے مختلف دائروں میں باہمی مشورے سے منصوبہ بنا کر کام کریں اور ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور اپنی اپنی مشکلات کے حل باہمی بحثوں سے دریافت کریں، اور پھر ہر موسم اور مرحلے کے لیے نظامِ اجتماعیت سے ہدایات حاصل کریں۔

یہ کام ایک امیر اور اس کے معاونین (اولی الامر) کے ذریعے چلتا ہے۔ لیکن دنیا میں سب سے مشکل کام کسی انسانی ریوڑ کا راعی بننا ہے۔ کیونکہ پیچھے چلنے والے بھیڑ بکریاں نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنے انتخاب کردہ امیر اور اربابِ شوریٰ جیسے انسان ہوتے ہیں۔ ویسا ہی ایمان رکھتے ہیں، خود اجتماعیت کی مشینری کے پرزے بن کر عملاً کام کرتے ہیں۔ اور ان کی مرضی سے کسی امیر کی امارت اور کسی مشیرِ امر کا شورائی مرتبہ قائم رہ سکتا ہے۔ وہ اگر راضی خوش اور مطمئن رہیں تو کام ٹھیک چلے گا۔ وہ اگر پریشان اور بددل ہو جائیں تو افرا تفری یا جمود و یاس یا چہ می گوئیوں اور ٹولیاں بننے کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ جس سے اجتماعیت کی مشینری بگڑ کر کام کو خراب کرے گی اور کام کرنے والے زراعت کارانِ حق بھی پراگندہ فکری میں اُلجھ کر اپنے فرائض ادا نہ کر سکیں گے۔

ان خطرات سے بچنے کے لیے دعوتِ حق کا کام کرنے والوں کو اجتماعیت کی ایک مشینری کا خاکہ دینِ حق نے دیا ہے، اس کے ساتھ ضروری اُصول دیئے ہیں، ہدایات دی ہیں اور ممنوعات کے نشان لگائے ہیں۔ ان میں سے ایک مرکزی حقیقت یہ ہے کہ جس شورائی نظام پر ہماری اجتماعیت مبنی ہے، اس کے دو پلڑے ہیں: ایک سمع و طاعت کا، دوسرا تنقید و احتساب کا! قدرتی طور پر ہر لیڈر، بادشاہ، وزیر اعظم

نہ غیرہ اپنے پہلے پلڑے کی تو پوری فکر کرتا ہے کہ اس کی ہر بات پر آمنّا وصدّقنا کہا جائے اور اس کے مطابق پورا انسانی گلہ اس کے اشاروں پر چلے، مگر دوسری جانب وہ اجتماعیت کی اصل قوت، یعنی ارکان اور ان کے چنے ہوئے نمائندوں کو کئی مختلف طریقوں سے تنقید و احتساب سے روکتا ہے۔ بسا اوقات یہ روکنا بھی غیر اطمینان بخش ہوتا ہے کہ وہ ناقدین و محتسبین کی بات سننے بھی، اس کا کوئی مدلل جواب نہ دے اور کبھی اس کی تائید بھی کر دے، مگر عملاً چلے اسی رویے پر جس سے شکایات پیدا ہوتی ہوں۔

بس میں چاہتا ہوں کہ اسلامی اجتماعیت کے شورائی نظام میں سمع وطاعت کے منتقامی عہدے اپنے ساتھیوں کی سوچ بچار کو تحقیر اور بے وقعتی سے نہ دیکھیں اور ان کے سوالات اور اعتراضات، شکوک و شبہات، تنقیدی مباحث اور احتسابی جائزوں کو نہایت محبانہ طریق سے سنیں، اُن کو ٹالنے کے بجائے ہنسی خوشی بالمراست ان کا جواب دیں، ان کے سامنے جذباتی مغالطہ انگیزیاں نہ کریں؛..... طرح طرح کی خوشخبریاں اور ملکوں ملکوں کی داستانیں اور بین الاقوامی فتوحات کے قصے سُنا سُنا کر ان کو بہکانے یا بہلانے سے اجتناب کریں۔ یہ چیز اسلامی نظامِ اجتماعیت کے خلاف ہے اس سے دُنیا ہی میں اپنا مجوزہ کام خراب نہیں ہوتا۔ بلکہ آخرت میں خدا کی ناراضی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیزاری کا خطرہ بھی واضح ہے۔ کیونکہ یہاں تو عہدوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ " اِنَّھَا اَمَانَۃٌ وَاِنَّھَا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ خِزْیٌ وَّ نَدَامَۃٌ "

(صحیحین)

یعنی معاملہ مذاق کا نہیں، ٹال مٹول کی گنجائش اس میں نہیں، نہایت سنجیدہ فریضہ ہے کہ جتنا بڑا عہدہ ہو اس کو اتنی ہی بڑی امانت ــــ خدا کی بھی اور خدا کے ان بندوں کی طرف سے بھی جنہوں نے آدمی کو اپنی آرا سے یہ ذمہ داری سونپی ہو۔ سمجھا جائے اور اس کے بارے میں خوف کھایا جائے کہ اس میں کوتاہی اور لغزش یا کوئی دانستہ ہیر پھیر یا مغالطہ انگیزی، یا کسی ضروری بات کو گول کر دینا یا لیپا پوتی کر کے

وقت گزارنا آخرت میں ندامت و رسوائی کا باعث ہوگا۔ اور حضورؐ کا یہ انتباہ بہت سخت ہے۔

یہاں میں اجتماعیت کے پورے نظام اور اس کے احکام و ضوابط کو بیان کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا، بس صرف ایک اشارہ ضروری حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ اس پر اگر توجہ نہ کی جائے گی تو ہمیشہ مشکلات پیش آئیں گی، نظامِ شورائی ہمیشہ بگڑے گا اور دعوت کا کام ہمیشہ تباہ ہوگا۔

وہ حقیقت یہ ہے کہ بسا اوقات کوئی ایک جزی واقعہ خواہ وہ کتنا ہی بڑا یا اہم ہو، قیادت اور جماعت کے درمیان یک لخت بے اعتمادی کی خلیج حائل نہیں کرسکتا۔ ہوتا یہ ہے کہ اگر اُوپر سے پالیسیوں کے بننے، ان پر عمل کرنے، احکام کے نافذ ہونے، نئے نئے اجنبی پروگراموں کے اختیار کرنے، معیارات اور طریقہ ہائے کار کو بدلنے کے واقعات مسلسل اس طرح وارد ہوں کہ چاہے بجائے خود ہر واقعہ چھوٹا بھی ہو مگر اس رائی کے پیچھے پربت چھپا ہوتا ہے۔ ایسے ہر امر پر سوالات پیدا ہوتے ہیں، تحیر پیدا ہوتا ہے، پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ مگر جلد ہی اس سے اگلے قدم کی باری آجاتی ہے یا کوئی بڑا مسئلہ توجہ کھینچ لیتا ہے۔ اس طرح لاینحل رہ جانے والے سوالات و اضطرابات کے تاروں کی گچھیاں سی بن جاتی ہیں، ایسے حالات میں پہلے خاموش کرب ہوتا ہے۔ پھر دھیمی دھیمی آوازیں اُٹھتی ہیں۔ پھر ایک ہنگامہ نمودار ہو جاتا ہے۔ اُس وقت کوئی دلخوش تقریر، مستقبل کا کوئی شاندار خواب، عالمِ اسلام یا بین الاقوامی سطحوں کے اہم واقعات و حوادث کے مفید پہلو سامنے لانے یا خطرات کا اثر طاری کرنے سے ذہنوں کی وہ گچھیاں نہیں سلجھتیں بلکہ ان میں اور زیادہ پیچ پڑتے ہیں۔

اس صورتِ حالات سے اگر کبھی کوئی قوت دوچار ہو جائے تو اوّل تو اس میں اتنی بڑی اخلاقی جرأت ہونی چاہیے کہ وہ اپنے کسی غلط طرزِ عمل کی مختلف کڑیوں کو اکٹھے ہی توڑنے کے لیے صاف صاف اعتراف کرلے کہ اب تک ہم نے بہت سے غلط موڑ مڑے اور اب ہم تاریخ کی گاڑی کا رُخ درست رکھیں گے۔ اگر ایسا ہو تو یہ

بات پلّے باندھ لینی چاہئیے کہ جماعت کے نصف صدی کے زیرِ عمل اُصول اور طریقِ کار اور اس کے مزاج اور تشخص کی پروا کئے بغیر کوئی چیز اس پر ٹھونسی نہ جائے۔ محض یہ بات کافی نہیں کہ کوئی قیادت اس کو اچھا سمجھتی ہے۔ کیوں نہ وہ پہلے جماعت کے سامنے غیر جذباتی انداز سے دلائل رکھ کر اسے اپنا ہم نوا بنائے اور اس قایل کر دے کہ لوگ اپنوں بیگانوں کے سامنے کسی مسئلے کو خود اپنا مسئلہ سمجھ کر اپنی جانب سے دلائل دیں اور ایمان وضمیر کی پوری قوت کے ساتھ دیں۔ اسلام کی شورائی اجتماعیت کے تحت کام چلانے والوں کو یہ بات کبھی فراموش نہ ہونی چاہیے کہ وہ جس ریوڑ کو لے کر چل رہے ہیں۔ وہ بھیڑ بکریوں اور مویشیوں کا ریوڑ نہیں ہے۔ وہ انسانی جماعت ہے، ہر شخص ایمان، عقل اور خودی (کم وبیش) رکھتا ہے، ہر شخص سوچتا ہے ہر شخص ماضی اور حال کے ربط وتسلسل کو دیکھتا ہے۔ ہر سال پچھلے کام کے رنگ ڈھنگ کے ساتھ نئے طور اطوار کو ملا کر جانچتا ہے۔ ہر شخص اپنے بڑوں کی ذہنی سطح کو بھی ناپتا ہے۔ پُرانے پیمانے بھی اس کے پاس ہیں اور نئے بھی۔ ایسے لوگوں کو لے کر چلنے کا یہی طریقہ ہے کہ ہر شخص کو محسوس کرایا جائے کہ سارے کام اور فیصلوں میں تمہاری حصہ داری (PARTICIPATION) ہے۔ تمہارے مسائل اور رجحانات اور تجاویز ہمارے سامنے ہیں۔ تمہارے اعتراضات اور احتسابات پر ہماری پوری نظر ہے۔ ہم تمہاری ساری ایمانی اور شعوری متاع کو بہت قدر ومحبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس سے اثر لیتے ہیں۔ نیز منصوبے اور پالیسیاں بنانے میں ملحوظ رکھتے ہیں۔ ہماری پالیسیاں اور منصوبے کسی فرد کا کارنامہ نہیں ہیں، بلکہ پوری جماعت ان کی تشکیل میں شامل ہے۔

یہ مقام اگر حاصل نہ کیا جائے تو کسی ایک یا دو یا تین مسئلوں میں پینترے بدلنے یا وضاحتیں دینے اور اپنے آپ کو غلطی سے محفوظ ظاہر کرنے سے بداعتمادی کی خلیج کبھی پاٹی نہیں جا سکتی۔

یہ باتیں ہیں نئے آنے والوں کے ہاتھوں تشکیل پانے والے مستقبل کا امکانی

نقشہ سامنے رکھ کر عرض کر رہا ہوں۔ تاکہ ہماری اجتماعیت یا قائدین اور اراکین کا رشتہ دعوتِ حق کے کسان جیسے محنت طلب اور صبر طلب کام کے لیے مفید ثابت ہو۔ اور خدا کرے کہ میرا حصہ بھی اس مہم میں درست طور پر ادا ہو۔ اور میں عنداللہ اپنے بنیادی کارِ دعوت میں کوتاہی کا، یا احباب کو توجہ دلانے میں مداہنت کا قصوروار قرار نہ پاؤں۔

حکمتِ سیّد مودودیؒ

جماعتِ اسلامی کا سنگِ بنیاد

خصوصیت کے سا تھ یہ کتاب (سیاسی کشمکش حصہ سوم) اس لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ یہی دراصل "جماعتِ اسلامی" کا سنگِ بنیاد ہے۔ اور اسی کی اشاعت کے بعد اس جماعت کی تاسیس عمل میں آئی ہے۔ جو اصحاب جماعتِ اسلامی کو اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہوں اُن کو میں مشورہ دُوں گا کہ پہلے اس کتاب کا مطالعہ کریں، پھر علی الترتیب ہماری حسبِ ذیل مطبوعات ملاحظہ فرمائیں:

۱ ۔ شہادتِ حق۔ ۲ ۔ جماعتِ اسلامی کی دعوت۔
۳ ۔ تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں۔
۴ ۔ دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات۔
۵ ۔ جماعتِ اسلامی، اس کا مقصد، تاریخ اور لائحۂ عمل۔
۶ ۔ مسلمانوں کے ماضی وحال اور مستقبل کے لیے لائحۂ عمل۔
۷ ۔ دستورِ جماعتِ اسلامی۔

(ابوالاعلیٰ)

نوٹ :۔ یہ عبارت ماخوذ ہے سیاسی کشمکش حصہ سوم کے ساتویں ایڈیشن ۱۹۵۵ء سے جو اس نام سے آخری ایڈیشن تھا۔ یہ عبارت اس کے دیباچے کا ایک حصہ ہے۔ یہ دیباچہ پھر کبھی شائع نہیں ہوا۔

(ادارہ)

رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم بحیثیّت شارع

جناب نور الٰہی صاحب ایڈووکیٹ گجرات

اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاوتِ قرآن، تزکیہ نفوس، کتابُ حکمت کی تعلیم اور کتاب اللہ کی تبیین و تشریح کی ذمہ داری تفویض فرمائی۔ نیز آنحضرتؐ کو نمونۂ تقلید، قاضی اور حاکم و فرمانروا قرار دیا۔ اور ان جملہ مناصب سے متعلقہ فرائض و ذمہ داریوں کو حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے بحیثیت رسول انجام دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو متعدد قسم کے تشریعی اختیارات تفویض فرمائے جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ بحیثیت معلّمِ کتاب و حکمت آنحضرتؐ کے متعلق فرمایا گیا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ج (آلِ عمران - ۱۶۴)

"حقیقت میں اللہ نے مومنین پر احسان کیا جب کہ انہیں میں سے ایک پیغمبر ان میں مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک صاف کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

یہی مضمون سورۃ البقرہ آیت ۱۲۹، ۱۵۱ اور سورۃ الجمعہ آیت ۲ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

تلاوتِ قرآن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب آنحضرتؐ پر قرآنِ کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپؐ پہلے اسے مردوں کے سامنے تلاوت کرتے اور پھر خواتین کے سامنے۔[1]

جہاں تک کسی کتاب کی تعلیم کا تعلق ہے اس سے مراد کتاب کے مضامین کی توضیح و تشریح ہے اور تعلیم کا مقصود یہ ہے کہ معلم کتاب کے جن مضامین کی تشریح ضروری سمجھتا ہے، ان کی وضاحت کرتا جاتا ہے۔ یہ طریقہ تعلیم معروف ہے۔ بعض اوقات طلبہ بھی کتاب کے مشکل مقامات کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور معلم ان کے جواب دے کر اشکالات حل کرتا ہے۔ تعلیم کتاب و حکمت کا مضمون اگرچہ پوری طرح واضح تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے آنحضرتؐ سے فرمایا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ - (النحل - ۴۴)

"اور یہ ذکر ہم نے تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے واضح کردو اس تعلیم کو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب کی توضیح و تشریح اپنی ذاتی رائے سے نہیں کی، بلکہ آپؐ نے یہ فریضہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت سے اللہ کی وحی کے مطابق انجام دیا۔ ارشادِ خداوندی ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝ (القیامۃ - ۱۶ تا ۱۹)

"آپؐ اس کو (یعنی قرآن کو) جلدی جلدی لینے کے لیے اس پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجیے۔ یہ تو ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کردینا اور

[1] ترجمہ سیرت ابن اسحاق پیرا ۱۹۲ - نقوش رسول نمبر ۱۱ ص ۱۵۰-

اس کا پڑھوانا۔ تو جب ہم اسے پڑھنے لگیں تو آپؐ اس کے تابع ہو جایا کیجیے۔ پھر اس کا بیان کرا دینا بھی ہمارے ذمہ ہے"۔

یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ قرآن کریم کے جمع کرنے، آنحضرتؐ سے تلاوت کرانے اور آپؐ کی زبانِ وحی ترجمان سے قرآن کی تشریح کرانے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد ـــ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ـــ کے مطابق قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری آنحضرتؐ کے ذریعے پوری فرمائی ہے۔ اسی طرح قرآن کے بیان یعنی اس کی تشریح و توضیح کا کام بھی آنحضرتؐ سے لیا۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی سورۃ القیامۃ کی آیت ۱۹ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

"قرآن کو رسولؐ تک بجنسہ پوری حفاظت کے ساتھ پہنچا دینا جو حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ لیا تھا، اس کا انصرام تو فرشتہ کی وساطت سے ہوا۔ اب رہا دوسرا وعدۂ الٰہی یعنی قرآن کی تبیین و تشریح یہ کس کے ذریعہ سے ہوگی؟ یہ رسول کے ذریعہ سے۔ گویا حق تعالیٰ سے رسول تک متنِ قرآن پہنچانے کا ذمہ دار تو فرشتۂ وحی ٹھہرا۔ اور رسولؐ سے اُمت تک متنِ قرآن و شرحِ قرآن پہنچانے کے ذمہ دار رسول کریمؐ قرار پائے۔ (ای ثم ان علینا ان نبینه بلسانك) یعنی پھر ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم آپؐ کی زبان سے اس قرآن کی تبیین و تشریح کریں۔ (روح المعانی) آج جس نو پیدا گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت صرف ایک خطوط رساں یا ڈاکیہ کی تسلیم کر رکھی ہے۔ کاش اس آیت سے ان کی آنکھیں کھلتیں"۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ تفہیم القرآن جلد ششم ص ۱۶۹ پر اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"اس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعے سے آپؐ کو ایسا علم دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن کے احکام و فرامین، اس کے اشارات، اس کے الفاظ اور اس کی مخصوص اصطلاحات کا جو مفہوم و مدعا حضورؐ کو سمجھایا جاتا تھا وہ اگر قرآن میں درج ہوتا تو یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ اس کا مطلب سمجھا دینا یا اس کی تشریح کر دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے کیونکہ وہ تو پھر قرآن ہی میں مل جاتا۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مطالبِ قرآن کی تفہیم و تشریح جو اللہ کی طرف سے کی جاتی تھی وہ بہر حال الفاظِ قرآن کے ماسوا تھی۔ یہ وحی خفی کا ایک اور ثبوت ہے جو ہمیں قرآن سے ملتا ہے۔"

(مزید ثبوت کے لیے ملاحظہ ہو سنت کی آئینی حیثیت صفحات ۹۴، ۹۵ اور صفحات ۱۱۸ تا ۱۲۵)۔

بحیثیتِ شارع آنحضرتؐ کا منصب یہ ہے کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم آنحضرتؐ کے ذریعہ سے بھیجا اور یہ فریضہ آپؐ کے سپرد فرمایا کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کی وحی کے مطابق قرآنی احکام کی توضیح و تشریح فرمائیں اور عملی حالات پر انہیں منطبق کر کے لوگوں کو ان احکام کا ٹھیک ٹھیک منشا سمجھائیں اور ان کی تعمیل کا طریقہ سکھائیں۔ چنانچہ معلم و شارح کتاب اللہ کی حیثیت سے آپؐ نے جو کچھ فرمایا اور کتاب اللہ پر عمل کر کے قرآنی احکام کا جو منشا متعین فرمایا وہ ہمارے لیے اسی طرح ماخذِ شریعت ہے جس طرح اللہ کی کتاب ماخذِ شریعت ہے۔ اگر آنحضرتؐ کی تشریح و تفسیرِ قرآن کو نہ مانا جائے تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم اپنے دعوائے ایمان میں کس حد تک مخلص ہیں۔

۲۔ قرآن کریم نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے لیے نمونۂ تقلید قرار دیا۔ فرمایا گیا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ

كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝

(الاحزاب-۲۱)

"تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک عمدہ نمونۂ تقلید ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخر کا اُمیدوار ہو اور ذکرِ الٰہی کثرت سے کرتا ہو۔"

آنحضرتؐ خیر البشر ہیں اور آپؐ کی حیاتِ طیبہ ساری کائناتِ انسانی کے لیے معیار اور نمونۂ تقلید ہے۔ آپؐ کی یہ صفت رسالت کے اعتبار سے ہے اور آپؐ ہمارے لیے مامور من اللہ رہنما اور پیشوا ہیں۔ اور آپؐ نے ہمہ پہلو بھرپور زندگی گذار کر اپنے قول و فعل و تقریر سے جو عملی رہنمائی بہم پہنچائی وہ سنت نبوی کی حیثیت سے ہمارے لیے شریعت ہے۔

۳۔ بحیثیتِ شارع رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک منصب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو قاضی مقرر فرمایا۔ ارشاد ربانی ہے:

ا۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (النساء-۶۵)

"سو آپؐ کے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ لوگ ہرگز ایمان دار نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے جھگڑوں میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اور پھر جو فیصلہ آپؐ کر دیں اس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور اس کو پورا پورا تسلیم کر لیں۔"

ب۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ط (النساء-۱۰۵)

"یقیناً ہم نے آپؐ پر کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے، تاکہ آپؐ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپؐ کو سمجھا دیا ہے۔"

ج ۔ وَ قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ط (الشوریٰ ۔ ۱۵)

"اور (اے نبیؐ) کہو کہ میں ایمان لایا ہوں اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں"۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کی حیثیت سے ہی قاضی ہیں اور ایک شخص کے ایمان بالرسالت کی صحت کا تقاضا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ قاضی تسلیم کرے ۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے مختلف مقدمات میں وقتاً فوقتاً جو فیصلے صادر فرمائے وہ ہمارے لیے شریعت ہیں اور ماخذِ قانون ہیں۔

امام ابوالحسن علی بن احمد واحدی نیشاپوری نے "اسباب النزول" میں سورۃ النساء کی آیت ۶۰[1] کا پس منظر بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

وقال الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس : نزلت فی رجل من المنافقین کان بینہ وبین یہودی خصومۃ، فقال الیہودی: انطلق بنا الی محمد ، وقال المنافق: بل ناتی کعب بن اشرف وھو الذی سماہ اللہ تعالی الطاغوت وابی الیہودی الا ان یخاصمہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، فلما رای المنافق ذالک اتی معہٗ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فاختصما الیہٗ فقضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للیہودی ۔ فلما خرجا من عندہٖ لزمہ المنافق وقال ، ننطلق الی عمر بن الخطابؓ

[1] اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝

فاقبلا الی عمر، فقال الیھودی: اختصمنا انا وھذا الی محمدؐ فقضی علیہ فلم یرض بقضائہ وزعم انہ مخاصم الیک وتعلق بی فجئت الیک معہ، فقال عمر للمنافق اکذالک؟ قال: نعم، فقال لھما: رویداً حتی اخرج الیکما، فدخل عمر واخذ السیف فاشتمل علیہ، ثم خرج الیھما وضرب بہ المنافق حتی برد، وقال ھکذا اقضی لمن لم یرض بقضاء اللہ وقضاء رسولہ۔

"کلبی نے ابو صالح کے حوالہ سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی کہ یہ آیت منافقین میں سے ایک آدمی اور ایک یہودی کے متعلق نازل ہوئی جن کے مابین ایک جھگڑا تھا۔ یہودی نے کہا کہ چلو، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس جھگڑے کا فیصلہ کراتے ہیں۔ منافق نے کہا ہمیں اس مقدمہ کا فیصلہ کعب بن اشرف سے کرانا چاہیے۔ (اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کعب کو طاغوت کا نام دیا ہے)۔ یہودی نے منافق کی اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ وہ اس مقدمے کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرانا چاہتا تھا۔ جب منافق نے یہ دیکھا تو وہ بامرِ مجبوری یہودی کے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ فریقین نے اپنا مقدمہ آنحضرتؐ کے سامنے پیش کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدمہ کا فیصلہ یہودی کے حق میں کر دیا۔ جب وہ دونوں دربارِ رسالت سے باہر آئے تو منافق یہودی کو پھر چمٹ گیا اور کہا کہ ہمیں عمرؓ بن خطاب کے پاس یہ مقدمہ لے جانا چاہیے۔ چنانچہ وہ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس گئے۔ یہودی نے بیان کیا کہ میں اور یہ شخص جو میرا فریقِ مخالف ہے، اپنا مقدمہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس فیصلہ کرانے کے لیے لے گئے تھے۔ آنحضرتؐ

نے اس کے خلاف فیصلہ صادر فرمایا لیکن یہ شخص اس فیصلے پر راضی نہیں ہے۔ اس لیے یہ آپ کے پاس فیصلہ کرانے کے لیے آیا ہے اور مجھے بھی مجبور کر کے آپ کے پاس لے آیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس منافق سے پوچھا کیا یہی معاملہ ہے؟ اُس نے جواب دیا "ہاں"۔ حضرت عمرؓ نے فریقین سے کہا: "تم ذرا ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں"۔ حضرت عمرؓ گھر میں داخل ہوئے، تلوار پکڑی اور اوپر کپڑا لپیٹ کر باہر آئے اور تلوار کا وار کر کے اُس منافق کا کام تمام کر دیا۔ اور فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے فیصلے پر راضی نہ ہو میں اس کا فیصلہ اسی طرح کیا کرتا ہوں"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت عمرؓ مدینہ منورہ میں مقدمات کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔ منافق اور یہودی کا مقدمہ جس میں آنحضرتؐ اپنا فیصلہ صادر کر چکے تھے جب حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا تو آپؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو اللہ کا فیصلہ قرار دیا۔ کیونکہ آپؐ اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے قاضی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تسلیم نہ کرے وہ مرتد ہے اور واجب القتل ہے۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے منافق مرتد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ آنحضرتؐ کے فیصلے آج بھی ہمارے لیے ایسے قانونی نظائر ہیں جنہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ سند اور حجت اور ماخذِ قانون ہیں۔ (باقی)

افواہیں اور اُن کے مہلک اثرات

شرعی نقطۂ نگاہ سے ایک جائزہ

جناب محمد یوسف فاروقی صاحب

(۲)

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عہدِ نبوی میں منافقین اور یہودی افواہیں پھیلانے اور اُمتِ مسلمہ کے مختلف طبقات کے درمیان منافرت پھیلانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اس کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کرتے تھے۔ عبداللہ بن ابی نے انصار و مہاجرین کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کے لیے علاقائی تعصب بھی اُبھارنے کی کوشش کی۔ انصار و مہاجرین کے درمیان خوشگوار تعلقات اور اسلامی اخوت و محبت نے مدینہ منورہ میں جو وحدت پیدا کر دی تھی۔ اس میں عبداللہ بن ابی کو اپنی سیاست چمکانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ باہمی نفرت پیدا کر کے اپنی قیادت کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ غزوہ بنو مصطلق سے واپسی پر عبداللہ بن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کے بارے میں یہ دھمکی آمیز الفاظ کہے تھے:

لَئِن رَّجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ (المنافقون - آیۃ ۸)

"اگر ہم مدینہ لوٹ جائیں تو وہاں سے عزت والے لوگ بے حیثیت لوگوں کو نکال باہر کریں گے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان منافقین کی حرکتوں پر کڑی نظر رکھتے تھے اور ان

کی تمام تخریبی حرکات کو اپنی حکمتِ عملی اور بصیرت سے غیر مؤثر بناتے رہے۔ منافقین کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور سرگوشی کے انداز میں آپ سے باتیں کرتے، ان کی سرگوشیوں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ عام لوگوں کو یہ تاثر دیا جائے کہ ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی اور قریبی تعلقات ہیں۔ یہ تاثر پیدا کرکے وہ جو باتیں رسول کریم کی طرف منسوب کرکے پھیلائیں گے عام لوگ اسے مان لیں گے۔ اسی طرح عام جگہوں پر کھڑے ہوکر سرگوشی کے انداز میں گفتگو کرتے تھے، جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ لوگوں کو یہ تاثر دیا جائے کہ کوئی خاص بات ہے جس کا صرف ان لوگوں کو علم ہے، یا شاید کوئی راز کی بات ہے جو انہیں معلوم ہوئی ہے۔ اس طرح ذہنی اور نفسیاتی طور پر راہ ہموار کی جاتی تھی۔ تاکہ جب کوئی افواہ پھیلائی جائے تو لوگ اس پر یقین کرلیں۔ یہ لوگ خفیہ اجتماعات بھی کرتے تھے۔ جس کا مقصد اپنی تخریبی پالیسیوں کا جائزہ لینا اور ان کو عملی شکل دینے کی تدابیر کرنا ہوتا تھا۔ قرآن حکیم نے منافقین کے خفیہ اجتماعات کے تین مقاصد کا ذکر کیا ہے۔ یہ لوگ گناہ کے کاموں، ظلم و زیادتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کے لیے اس قسم کے اجلاس کرتے تھے۔ منافقین کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے قرآن حکیم نے سرگوشیاں کرنے اور رازداری کے انداز میں گفتگو کرنے پر منافقین پر پابندی لگا دی تاکہ یہ لوگ عام لوگوں میں کوئی غلط تاثر پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوں۔

قرآن کریم نے فرعون کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ بہت غرور میں مبتلا تھا، اپنے اقتدار کی خاطر لوگوں میں نسلی امتیاز پیدا کرتا تھا۔ اور ان میں پھوٹ ڈال کر ان پر حکومت کرتا تھا۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝ (القصص - آیت: ۴)

" فرعون نے زمین میں سر اُٹھا رکھا تھا۔ اس نے وہاں کے باشندوں

کو فرقوں میں تقسیم کر دیا تھا، ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتا اور لڑکیوں
کو زندہ رکھتا، یقیناً وہ فساد برپا کرنے والوں میں تھا"۔

اس آیتِ مبارکہ میں فرعون کے بھیانک جرائم کو فساد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اُوپر ہم نے منافقین کی تخریبی حرکتوں کو بیان کیا ہے جن میں افواہیں اور جھوٹی خبریں پھیلانا بھی شامل ہے۔ سورۃ البقرہ میں منافقین کی ان حرکتوں کو فساد سے تعبیر کیا گیا ہے:

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۔ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۔ (البقرہ ۲: ۱۱-۱۲)

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کر رہے ہیں، خبردار! یہی لوگ فسادی ہیں، مگر انہیں شعور نہیں"۔

فساد اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (البقرہ ۲: ۲۰۵)

"اور اللہ تعالیٰ فتنہ انگیزی کو پسند نہیں کرتا"۔

اخلاقی نقطۂ نگاہ سے غور کریں تو بھی افواہیں پھیلانا بہت گھٹیا اور مذموم حرکت ہے، اس لیے کہ غیبت کرنا، تہمتیں لگانا، جھوٹ بولنا، لوگوں کی کردارکشی کرنا اور تحقیر و تذلیل نہ صرف گناہ کبیرہ ہیں، بلکہ وہ بُرائیاں ہیں جنہیں تمام اخلاقی نظام غیراخلاقی حرکت تصور کر کے رد کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ افواہیں پھیلانے میں ان تمام بُرائیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اسلام کا اخلاقی ضابطہ تو ایسے کردار کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے جس کی بنیاد صداقت، امانت و دیانت داری، باہمی اخلاص و محبت، اعتماد اور عدل و انصاف پر ہوتی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر انسان فطرتاً اچھا ہے بدگمانی گناہ ہے۔ حدیثِ نبوی میں ہے کہ اہلِ ایمان کے بارے میں اچھا گمان رکھو۔ بلاوجہ تجسس اور عیب جوئی بھی جائز نہیں ہے۔

ہماری اس بحث اور گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن وسنت کی رُو سے افواہیں پھیلانا یا بے بنیاد خبریں شائع کرنا قطعاً جائز نہیں۔ اس قسم کی حرکتوں میں جو لوگ ملوث ہوں گے وہ جرم میں ملوث تصور کئے جائیں گے۔ ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ قرآن وسنت میں جہاں اس قسم کی مذموم حرکتوں پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ وہاں مملکت کے عام اور ذمہ دار شہریوں پر بھی یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ بھی افواہوں کی روک تھام میں اپنی ذمہ داریاں پوری کریں۔ افواہیں پھیلانے والوں پر کڑی نظر رکھیں۔ ان کی پھیلائی ہوئی باتوں کو خود بیان کر کے نہ پھیلائیں۔ اور اگر کوئی خبر ایسی ہے جس کا تعلق ملک وملت کی سلامتی سے ہے تو فوری طور پر ارباب حل وعقد کو مطلع کر کے افواہوں کی روک تھام اور ملک وملت کی سلامتی کے معاملات میں ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں۔

افواہوں کی روک تھام میں حکومت کا کردار بھی بہت اہم ہے۔ خاص طور پر نشر واشاعت کے وہ ادارے جو حکومت کی زیر نگرانی کام کر رہے ہیں۔ مثلاً ریڈیو یا ٹیلی ویژن وغیرہ، اس سلسلہ میں سب سے اہم کام یہ کرنا ہوگا کہ یہ ادارے عوام میں اپنا اعتماد پیدا کریں تاکہ لوگ ان اداروں کی مہیا کردہ اطلاعات پر بھروسہ کر سکیں۔ یہ ادارے کردار سازی کا تو کام کریں، لیکن کردار کشی کے لیے استعمال نہ ہوں۔ ان اداروں پر اعتماد بحال ہوتے سے افواہ سازوں کی حوصلہ شکنی ہوگی۔

ہماری ملکی اور ملی صحافت پر بھی بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ہمارے بعض اخبارات کا طرز عمل تو بہت ہی غیر محتاط ہوتا ہے۔ وہ غیر مصدقہ اور بے بنیاد خبریں شائع کر کے معاشرہ اور مملکت دونوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اخبارات کو چاہیے کہ وہ ایسی خبریں جن کا براہ راست اثر ملک وملت پر پڑتا ہو یا جن سے ہمارے ملی ادارے متاثر ہوتے ہوں یا افراد کے کردار پر ان کا اثر پڑتا ہو، بلا تحقیق شائع نہ کریں، بلکہ اچھی طرح چھان بین کر کے پورے اطمینان کے

(باقی بر صفحہ ۵۰)

ہمارے تعلیمی نظام میں کوئی خامی ہے!

پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

اور وں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے

(اقبال)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

الدین نصح ۔ دین کا تقاضا مسلمانوں کے ساتھ مخلصانہ خیر خواہی کرنا ہے۔
مخلصانہ خیر خواہی مجھے اس بات پر مجبور کر رہی ہے کہ رسمی الفاظ کا پیغام نہ دوں، بلکہ حقیقی خیر خواہی کا پیغام دوں۔

ہمارے ملک میں تعلیم کے معماروں نے بتایا ہے کہ تعلیم مستقبل کو تابناک بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ تعلیم افراد کو اس طرح تیار کرتی ہے کہ آئندہ زندگی وہ کامیاب اور بامراد گزاریں۔ اسکولوں اور کالجوں میں ہر طرف کامیاب زندگی بسر کرنے کی تیاریاں جا رہی ہیں۔ تعلیم کے معماروں نے بتایا ہے کہ اس کے لیے انگریزی جاننا ضروری ہے۔ اس لیے نرسری درجات سے قوم کے بچے انگریزی پڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس کے لیے سائنس کی تعلیم ضروری ہے۔ اس لیے پرائمری درجات سے سائنس کی تعلیم جاری ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس کے لیے فنی اور کمپیوٹر کی تعلیم ضروری ہے۔ اس لیے ثانوی درجات سے فنی اور کمپیوٹر کی تعلیم جاری ہے۔ نصف صدی سے ہمارے ملک کا تعلیمی نظام ان مقاصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہے۔ اس عرصہ میں دو نسلیں تعلیم گاہوں سے

تیار ہو کر نکل چکی ہیں۔ یہ نسلیں نئے مقاصد کے تحت ساختہ پرداختہ ہیں۔ اس لیے ان کے طرزِ عمل سے، ان کے رویّہ سے بڑی حد تک ان مقاصد کے حُسن و قبح کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ان مقاصد کے تحت اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ڈاکٹر، انجینئر، ٹیکنوکریٹ، بزنس میگنٹ بیوروکریٹ، ایڈووکیٹ وغیرہ وغیرہ بن کر نکل رہے ہیں۔ حکومت کے اندر اعلیٰ مناصب پر اور معاشرہ میں اعلیٰ مراتب پر فائز ہو رہے ہیں۔ اعلیٰ ملازمت، اعلیٰ رہائش، اعلیٰ مقام حاصل کر رہے ہیں۔ وہ کامیاب اور بامراد زندگی گزار رہے ہیں۔

مگر معلوم ہوا کہ بعض پہلوؤں سے معماروں کا دیا ہوا مقصد ناقص ہے۔ قومی صنعتی سطح پر کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی۔ شکست و ریخت سے دوچار ہو جانے والے جرمن اور جاپان کو ہمارے بعد صنعتی میدان میں قدم رکھنے کی اجازت ملی تھی۔ آج وہ سب قوموں سے آگے ہیں۔ کوریا اور تائیوان پس ماندہ ملک تھے۔ ہمارے بعد ان کو آزادی ملی ہے۔ صنعت و حرفت میں وہ بھی ہم سے بہت آگے ہیں۔ ہماری حکومتیں نصف صدی سے سائنس اور فنی تعلیم کا وظیفہ پڑھ رہی ہیں۔ مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ابھی بہت پیچھے ہیں۔ ضرور ہمارے تعلیمی مقاصد کی تشکیل میں کوئی خامی ہے۔ قومی ترقی کا کوئی مطمح نظر نہیں دیا گیا۔

معاشرہ میں اور حکومت میں کاربرآری تعلیم یافتہ طبقہ کے ہاتھ میں ہے۔ نصف صدی کی سربراہی کے بعد آج حالت یہ ہے کہ ہر جگہ بدکرداری، بدعنوانی، بداخلاقی، بدتمیزی اور ظلم اور ناانصافی کا ایک طوفان برپا ہے۔ معاشرہ کا کوئی گوشہ اس سیلابِ بلا سے محفوظ نہیں۔ تعلیم جو تعمیرِ قوم کا اہم شعبہ ہے، جس سے بڑی امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں۔ اس میں بھی بدعنوانی اور بدکرداری انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اس میں شاگرد، استاد

---

[1] لاہور کالج آف ایجوکیشن کے تحت "معمارانِ ملت کا ترجمان دانش" کے اجرا پر پیغام طلب کرنے پر لکھا گیا۔

اور انتظامیہ سب ہی ملوث ہیں ۔ ضرور ہمارے تعلیمی مقاصد کی تشکیل میں کوئی خامی ہے ۔ تعلیم نے افراد کو خوش حال زندگی کا مطمح نظر دیا ہے ۔ اس نے افراد کو خود غرض اور زر پرست بنا دیا ۔ انہوں نے معاشرہ کو چراگاہ تصور کر لیا ہے ۔ ہر شخص اس میں چرتا چگتا پھرتا ہے ۔ تعلیمی مقاصد میں معاشرہ کی فلاح و بہبود کا کہیں ذکر نہیں ۔

ملک کی سیاسی زندگی کی حالت بھی ابتر ہے ۔ اسمبلیوں کے ارکان سارے ہی تعلیم یافتہ افراد ہیں ۔ مگر خود غرضی اور زر پرستی نے انہیں قابلِ فروخت جنس بنا دیا ہے ۔ جس کا مظاہرہ انتخاب کے موقع پر ہوتا ہے ۔ نصف صدی قبل ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں بھی اگر مسلمان قوم اس طرح زر پرست ہوتی تو ہندو کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ مسلمان رائے دہندگان کو خرید سکتا تھا ۔ مگر اس وقت ایک فرد بھی نہیں بکا ۔ ہندوستان کے صوبوں کے مسلمانوں نے سو فیصد پاکستان کے حق میں رائے دی تھی ۔ اُس وقت ایک ایک فرد قومی اور ملی مقاصد کی اہمیت کو سمجھتا تھا ۔ ذاتی مفادات کو ان پر قربان کرتا تھا ۔ آج وہ بات نہیں ۔ ضرور ہمارے تعلیمی مقاصد میں خامی ہے ۔

انفرادی سطح پر بھی خود غرضی کی تباہی عام ہے ۔ یہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر، اعلیٰ تعلیم یافتہ انجینیر ۔ نہایت گھناؤنی خود غرضی کا مظاہرہ کرتا ہے ۔ کبھی کوئی فرد دوسری لڑکی سے شادی کرنے کی خاطر اپنی بیوی کو نہر پر لے جا کر گولی مار دیتا ہے ۔ ایک ڈاکٹر صاحب سات سال امریکہ میں رہ کر آئے ۔ ان کا حال یہ ہے کہ جس سے ناراض ہوئے گولی مار کر اُس کو ٹھنڈا کر دیا ۔ سات افراد ہلاک کر ڈالے ۔ یہاں ایسے بھی واقعات پیش آتے ہیں کہ حادثہ میں شوہر کے انتقال پر بیوہ بہن اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ بھائی کے گھر آئی ۔ کئی کنال کی کوٹھی میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ۔ بیچاری چپڑاسی کی کوٹھڑی میں گزارہ کرتی ہے ۔ آج کل ڈاکے پڑ رہے ہیں ان میں اعلیٰ گھرانوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکے ملوث ہوتے ہیں ۔ آج کل اغوا ہو رہے ہیں ان میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد ملوث ہوتے ہیں ۔ خود غرضی اور زر پرستی کا نشہ اس قدر چڑھ گیا ہے کہ اب یہ انسانی زندگیوں سے کھیل رہا ہے ۔ ضرور ہمارے تعلیمی مقاصد کی تشکیل میں کوئی

خامی ہے۔ ان میں نہ تربیت اخلاق ہے اور نہ تزکیہ نفس ہے، نہ آخرت میں جوابدہی کا تصور شامل ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ روشن مستقبل بنانے والی تعلیم کے معماروں کے نہاں خانۂ دل میں زندگی کا تصور قبر سے ورے ورے ہے۔ اس لیے انہوں نے بس مادّی تقاضوں اور مادّی آسائشوں کی خوب تیاری کی ہے۔ مگر ہم تو مسلمان ہیں، ہمارا تو اللہ پر، رسولؐ پر اور آخرت پر ایمان ہے۔ ہمارے نزدیک تو کامیابی ہی آخرت کی کامیابی ہے۔

موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ عملاً ہم قبر سے ورے ورے کی زندگی کی تیاری کر رہے ہیں اور اس کی کامیابی چاہتے ہیں۔ مگر ہمارا ایمان آخرت میں کامیابی کی دعائیں مانگتا ہے۔ تعلیم کے معمار اس کامیابی کے لیے کسی تیاری کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے فقدان سے ہی ہمارے معاشرہ میں وہ ابتری پھیل رہی ہے جس کا مظاہرہ ہر طرف ہو رہا ہے۔

کیا ہمیں یہ کھلا تضاد محسوس نہیں ہوتا۔ کیا مسلمان ہو کر اپنی اس نامسلمانی کی روش کی کوئی خلش دل میں نہیں چبھتی۔

ع شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات

کویت کی جغرافی و تاریخی حیثیت

از ڈاکٹر سید رضوان علی - کراچی یونیورسٹی

کویت کی اپنی تاریخ کیا ہے؟ اس کا وجود کتنا پرانا ہے؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری صحافت میں اس سے متعلق جو تھوڑا بہت مواد بعض مولوی صاحبان کے قلم سے شائع ہوا ہے، وہ حقیقت سے کوسوں دور ہے، بعض حضرات نے ہم سے اس سلسلہ میں استفسار کیا، اور یقیناً دوسرے بہت سے لوگ بھی جاننا چاہتے ہوں گے اس لیے آئندہ سطور میں ہم کویت کی جغرافیائی اور تاریخی حیثیت پر کچھ مختصر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

نقشہ میں کویت کا محلِ وقوع دیکھنے سے پتہ چلے گا کہ یہ تقریباً ایک مثلث کی شکل کا قطعۂ زمین ہے۔ اس کا رقبہ ۱۷،۸۱۸ کیلومیٹر مربع ہے، شمالی حدود عراق سے ملتی ہیں۔ اور جنوبی سعودی عرب سے اور اس مثلث کا مشرقی حصہ خلیج فارس یا خلیج عربی یا اب صرف خلیج پر واقع ہے۔ یہ سارا علاقہ ریگستان ہے۔ موجودہ زمانہ میں کویت میں جو تھوڑی بہت سرسبزی و شادابی ہے۔ یہ مصنوعی طور پر سمندر کے پانی کو میٹھا کرکے اور سبزہ اگا کر کی گئی ہے۔

قدیم جغرافیائی عربی کتابوں میں جو ابن خرداذبہ، اصطخری، ابن حوقل، مقدسی وغیرہ کے قلم سے المسالک والممالک کے نام سے (ابن حوقل کی کتاب کا صحیح، تحقیقی نام صورۃ الارض ہے) چوتھی صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری تک لکھی گئی ہیں۔ ان میں کویت کا نام نہیں۔ اس سلسلہ کی سب سے اہم اور ضخیم ترین کتاب ساتویں صدی ہجری کے

یاقوت الحموی کی کتاب معجم البلدان (پانچ جلدیں) ہے اور یہ ایک ڈکشنری کی صورت میں ہے۔ اس میں بھی کویت کا کہیں ذکر نہیں، جب کہ اس میں عالم عرب بلکہ عالم اسلام کے ہزاروں شہروں اور گاؤں تک کا ذکر ہے۔ اسی طرح قدیم تاریخی کتب، تاریخ طبری، تاریخ مسعودی (مروج الذہب) اور تاریخ ابن الاثیر (الکامل فی التاریخ) اور تاریخ ابن خلدون میں بھی اس کا ذکر نہیں ملتا۔

پھر سوال یہ ہے کہ آخر کار کویت کس طرح اور کب وجود میں آیا؟ اور اس کا عراق یا سعودی عرب سے کیا تعلق ہے؟

موجودہ دور میں عربی زبان میں کویت سے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے ایک قدیم کتاب لبنان کے مشہور امریکی الجنسیہ، مؤرخ، ادیب اور سیّاح امین اریحانی کی "ملوک العرب" ہے جو اس نے جزیرۂ عرب، عراق اور خلیج کی دوسری ریاستوں کی سیاحت کے بعد ۱۹۲۴ء میں لکھی تھی۔ یہ کتاب دنیا کی تمام مشہور زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اس میں کویت کی تاریخ پر بہت کچھ تحریر ہے۔ خیر الدین الزرکلی کی "الاعلام" میں بھی کویت کے حکام پر کافی مواد ہے۔ ایک کتاب میرے مرحوم مصری دوست ڈاکٹر شیخ احمد الشرباصی (استاذ جامعۂ ازہر) کی "ایام الکویت" کے نام سے ہے جو انھوں نے کویت میں ایک سال کے قیام کے بعد ۱۹۵۴ء میں شائع کی تھی۔ ایک دوسری ضخیم کتاب "البلدان الاسلامیۃ فی العالم المعاصر" (مسلمان ممالک عصر حاضر میں) ریاض کی امام محمد بن سعود اسلامک یونیورسٹی کی طرف سے ۱۹۷۹ء میں ریاض میں منعقد "پہلی جغرافیہ اسلامی کانفرنس" کے موقع پر شائع کی گئی ہے۔

ان چند مستند کتابوں اور تاریخ طبری و معجم البلدان یاقوت میں وارد اشارات سے جو حقائق کویت کی تاریخ کے بارے میں معلوم ہوتے ہیں ان کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

لفظ کویت کوت کی تصغیر ہے۔ یہ لفظ عربی زبان کا نہیں اور کسی عربی لغت میں مذکور نہیں۔ بعض عرب مصنفین نے اس کو عراقی زبان کا لفظ بتایا ہے۔ درحقیقت جیسا کہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ یہ "کوت" ہندی

لفظ کوٹ[1] ہے۔ ہمارے ملک میں اس لفظ کی ترکیب کے ساتھ عمر کوٹ، بالا کوٹ، راجی کوٹ کے قصبے مشہور ہیں۔ عراق میں جاکر اس لفظ کا تلفظ کوٹ کی طرح "کوت" ہو گیا اور وہاں اس نام سے بغداد کے جنوب میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک شہر کا نام "کوت العمارۃ" ہے، جو آج کل صرف "الکوت" کے نام سے مشہور ہے اور عراق کے نقشوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

عراق اور خلیج میں مستعمل عربی زبان میں ہندوستانی اور فارسی زبانوں کے بہت سے الفاظ مستعمل ہیں، جیسے میز، دروازہ، شلغم، دوشک (توشک) وغیرہ وغیرہ۔ اور "کوت" ایک چھوٹے سے ایسے قلعہ یا گڑھی کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کے آس پاس کچھ دوسرے مکانات بھی ہوں اور یہ عام طور پر کسی دریا، سمندر یا اور کسی قسم کے پانی کے کنارے ہو۔ جس طرح عراق کا "الکوت" دریائے دجلہ کے کنارے آباد ہے۔

اسی طرح مختلف روایات کے مطابق گیارھویں صدی ہجری کے اواخر میں خانہ بدوش بدو قبیلہ بنی خالد کے ایک سردار براک بن غرار الحمیدی نے موجودہ کویت کے علاقہ قرین میں ایک قلعہ یا گڑھی بنائی جس کا نام "الکوت" رکھا اور ایک دوسرا چھوٹا سا قلعہ یا گڑھی بنائی جو ساحل سمندر کے پاس تھی اور اس کا نام "الکویت" رکھا کہ اس میں بصرہ سے براہ سمندر آنے والا سامانِ رسد محفوظ رکھا جاتا تھا اور اس کے آس پاس کچھ مکانات آباد تھے۔ اس زمانہ میں خلیج فارس کے علاقہ میں قبائل میں آپس کی لڑائی اور سمندر میں قزاقی (PIRACY) عام تھی۔ بارھویں صدی ہجری کے اوائل میں جنوبی نجد کے ریگستانی علاقہ "افلاج" سے ایک قبائلی سردار صباح اپنے قبیلہ عنزہ کے افراد کے ساتھ آکر یہاں آباد ہوا اس نے کویت پر قبضہ کر لیا یا کویت کے سردار قبیلہ محمد بن عریعر نے اس کو یہ قلعہ دے دیا۔ چونکہ یہ لوگ نوشت و خواند سے ناآشنا تھے۔ اور اس زمانہ کا کوئی تحریری سرمایہ موجود نہیں۔ اس لیے قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس خاندان

---

[1] ڈاکٹر احمد الشرباصی مرحوم نے اس کو عراقی (لوکل عراقی) زبان کا لفظ بتایا ہے۔

کا ورود وہاں کس سن میں ہوا۔ مختلف زبانی روایات کے مطابق یہ لوگ گیارھویں صدی ہجری کے اواخر یا بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی) کے اوائل میں نجد کے ریگستانی علاقہ سے یہاں آکر آباد ہوئے۔ اور صباح کو یہاں کے لوگوں نے ڈاکٹر شیخ احمد الشرباصی کی روایت کے مطابق ۱۱۱۰ھ میں اپنا سردار چن لیا۔ ایک دوسری تاریخ انہوں نے ہی ۱۱۲۵ھ دی ہے۔ میرے نزدیک یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس سردار اور موجودہ معزول کویتی حکمران خاندان کے مورث اعلیٰ کی وفات ۱۱۷۵ھ میں ہوئی اور ۶۵ سال تک اس کی "مشیخت" یا حکومت ناقابلِ تصور ہے۔

یہ بات تو یقینی ہے کہ "کویت" کی تاریخ اسی "آل صباح" کے وہاں آباد ہونے سے شروع ہوتی ہے۔ یہ ایک غیر آباد ساحلی علاقہ تھا جس میں نئی آبادی شروع ہوئی تھی۔ اس لیے دُور تو کیا خود اس علاقہ میں کویت کا کوئی خاص ذکر نہ تھا۔ جب کہ شمال میں عراق کا بندرگاہ بصرہ اور جنوب میں عمان کے سواحل مشہور تھے، لیکن اس خاندان کے تیسرے حاکم جابر بن عبد اللہ بن صباح (۱۲۲۹ — ۱۲۷۲ھ) کے عہد میں جس نے ۴۳ سال حکمرانی کی، اس چھوٹی سی شہری ریاست کا نوٹس سلطنتِ عثمانیہ نے لیا۔ اس شیخ نے بصرہ کی داخلی لڑائی میں سلطنتِ عثمانیہ کے ترکی گورنر کی اپنے آدمیوں سے مدد کی، جس پر ترکی حکومت نے اس کو پروانۂ حکومت اور ایک سبز پرچم دیا اور سالانہ ڈیڑھ سو من کھجوروں کی مدد مقرر کی جو بعد کو دوسرے حکام کے عہد میں بھی جاری رہی۔

اس طرح کہا جاتا ہے کہ کویت کی تاریخ تقریباً صرف تین پونے تین سو سال پُرانی ہے اور اس کا سیاسی وجود انیسویں صدی کے نصف اوّل میں یعنی ڈیڑھ پونے دو سو سال قبل شروع ہوا۔ جب کویت کے تیسرے قبائلی سردار جابر بن عبد اللہ بن صباح کو عثمانی سلطنت نے اپنے تابع ایک آزاد حکمران تسلیم کیا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اسی حاکم کے عہد میں بعض انگریز انڈیا سے کویت آئے اور انہوں نے شیخ جابر سے یہاں برطانوی پرچم لہرانے کی اجازت طلب کی اور

چاہا کہ کویت میں کچھ تجارتی عمارات بنائیں کہ اس صدی میں سمندروں اور سمندری سواحل کی "شاہی" انگریزوں کے قبضہ میں تھی اور وہ برابر اس کو وسیع تر کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ لیکن جابر الصباح نے عثمانی ترکی سلطنت سے اپنے تعلقات کی بنا پر انگریزوں کے اس مطالبہ کا انکار کر دیا۔

لیکن کویت کے ساتویں حاکم مبارک الصباح نے جو ایک سخت گیر، عالی ہمت، طالع آزما اور مطلب پرست شخص تھا اور اپنے دو بھائیوں کو خفیہ طور پر قتل کرکے حکمران بنا تھا خاندانی اختلافات اور انتقامی تحریکات کی وجہ سے ترکوں سے ڈر کر اور انگریزوں کے دباؤ کے تحت ۱۸۹۹ء میں برطانوی حکومت سے معاہدہ کر لیا۔ جس کے تحت کویت انگریزوں کے تابع ہو گیا۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ کویت کے داخلی فتنہ کے سبب سلطنتِ عثمانیہ کا مطالبہ تھا کہ مبارک الصباح یا تو استنبول آجائے جہاں اسے عزت و احترام کے ساتھ مجلسِ مشاورت کا ممبر بنا لیا جائے گا یا کسی اور ملک میں چلا جائے اور اس کو سالانہ تنخواہ ملتی رہے گی۔ یا پھر اس کے خلاف قوت استعمال کی جائے گی۔ انگریزوں کو جب اس کی بھنک پڑی (جو پہلے سے کویت پر اپنا پرچم لہراتے کے خواہشمند تھے) تو انہوں نے اس زمانہ کی اپنی (GUNBOAT DIPLOMACY) کے مطابق دو جنگی جہاز کویت کے ساحل پر بھیج دیئے۔ اس طرح بزور کویت سے معاہدہ کرکے اپنے تابع کر لیا۔ اس معاہدہ کے مطابق یہ طے ہوا کہ حکومت آلِ صباح میں رہے گی۔ کویت اپنے داخلی اُمور میں آزاد ہوگا۔ لیکن خارجہ پالیسی اور عسکری اُمور انگریزوں کے ماتحت ہوں گے اور انگریز خارجی حملوں سے اس کی حفاظت کریں گے۔

اس طرح ۹۱ سال قبل کویت انگریزوں کے تابع ہو گیا۔ جیسے تقسیم ہند سے قبل ہندوستان کے نواب اور راجے، مہاراجے انگریزوں کے تابع تھے۔ ۱۹۶۱ء میں کویت کو آزادی ملی اور اب تیس سال بعد انگریز نئے سیاسی حقائق کے تحت امریکیوں کے ساتھ کویت پر دوبارہ اپنا قبضہ جمانے کے لیے تین ہفتوں سے عراق پر ہولناک بمباری کر رہے ہیں اور کویت کی سرزمین کو عراقیوں کے خون سے لالہ زار

بنانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

لیکن کویت کی تاریخ کے حوالے سے دو سوال ہنوز جواب طلب ہیں کہ تین پونے تین سو سال قبل "کویت" نام کی زمین اچانک تو سمندر سے نمودار نہیں ہوگئی، اس کے وجود کو اس سے قبل کس نام سے پہچانا جاتا تھا اور یہ کہ عراق یا جزیرۂ عرب سے اس کا کیا تعلق رہا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ عام تواریخ اس بارے میں خاموش ہیں، نہ تو ملوک العرب کے مصنف امین الریحانی نے اس بارے میں کچھ لکھا ہے اور نہ مصری مصنف "ایام الکویت" نے اس پر توجہ دی ہے۔ خیرالدین الزرکلی نے الاعلام (۲/۲۸۵) میں خلیج کے ایک مصنف کی ایک قلمی کتاب "مذکرات خالد الفرج" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کویت کی جگہ پہلے قرین تھا۔ مرحوم زرکلی نے اس معاصر مصنف کا صرف یہ قول نقل کر دیا ہے اور اپنی طرف سے کوئی یقینی بات نہیں کہی ہے۔

ہمارے نزدیک خالد الفرج کی یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ قرین کا نام نہ تو یاقوت کی معجم البلدان میں ہے اور نہ کسی اور جغرافیہ کی قدیم عربی کتاب میں، اور نہ اس کا وجود کویت کے تفصیلی نقشوں میں نظر آتا ہے۔ جو کتاب "البلدان الاسلامیۃ" اور سعید صباغ کے الاطلس العربی میں دیے ہوئے ہیں۔ درحقیقت "قرین" کویت شہر کے کافی جنوب مشرق میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔ یہ کویت اور سعودی عرب کے مابین جنوب میں آزاد علاقہ سے متصل ہے اور یہاں کوئی آبادی نہیں۔

ہمارے نزدیک کویت کا علاقہ زمانۂ قدیم میں "کاظمہ" کے نام سے معروف تھا، اس کی دلیل یہ ہے کہ شہروں اور راستوں کے بارے میں جو قدیم ترین عربی کتاب ابن خرداذبہ کی المسالک والممالک (تصنیف ۲۷۲ھ) موجود ہے اس میں بصرہ سے یمامہ (موجودہ ریاض) اور یمامہ سے بصرہ کا جو راستہ اور منازل مذکور ہیں، ان میں بصرہ کے بعد پہلی منزل ہی کاظمہ ہے اور یہی بات قدرے تفصیل سے ساتویں صدی ہجری میں یاقوت نے معجم البلدان کاظمہ کے ذکر میں (۴/۴۲۱) لکھی ہے۔ اس نے

بتایا ہے کہ ساحل سمندر سے قریب یہ ایک داخلی وسیع علاقہ ہے۔ اور یہاں پانی کے کنوؤں پر کافی حوض ہیں اور پانی پینے کے قابل ہے۔ اس نے اس کو بصرہ سے دو منزل بتایا ہے اور یہ کہ یہ بصرہ سے جزیرۂ عرب کے مشرقی ساحل کو جانے والے راستہ پر واقع ہے[1]۔ ریاض سے کویت جانے والا راستہ آج بھی موجود ہے۔ وہاں سے بصرہ کے لیے میں نے بھی ۱۹۶۴ء میں سفر کیا تھا۔

اس کاظمہ کا ذکر ہم کو تاریخ طبری میں بھی متعدد بار ملتا ہے۔ اسلام سے قبل بھی اور اسلام کے بعد بھی، اس علاقہ میں عربوں اور ایرانیوں کے مابین ایک جنگ کسریٰ شاپور کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ اور ایک دوسری یادگار جنگ "معرکۂ ذات السلاسل" کے نام سے حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جنگ یمامہ کے فوراً بعد ہوئی۔ مسیلمہ کذاب اور اس کے مرتد متبعین کی خالد بن الولید کے ہاتھوں یمامہ (ریاض) میں شکست کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اس لشکر کو شمال میں ایرانی علاقہ (عراق) میں واقع حیرہ (جہاں بعد کو کوفہ آباد ہوا) کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا۔ اور یہاں ایرانیوں کو زبردست شکست ہوئی۔ (ملاحظہ ہو تاریخ طبری حوادث ۱۲ھ ۳/۳۴۶-۴۹۰) یاد رہے کہ اس زمانہ میں بصرہ کی جگہ قدیم ایرانی پورٹ اُبلہ آباد تھا، جہاں ایرانی فوج رہتی تھی۔ جو وہاں سے خلیج فارس کو کنٹرول کرتی تھی اور عربوں پر حملے کرتی رہتی تھی۔ جیسا کہ طبری نے اس موقعہ پر لکھا ہے اور "حیرہ" کے لیے یمامہ کا راستہ اُبلہ سے ہو کر گذرتا تھا۔

اب اگر ہم کویت کے موجودہ نقشہ میں دیکھیں تو موجودہ شہر کویت کے مغرب میں خلیج کویت کے ساحل پر "کاظمہ" کا نام نظر آتا ہے۔ جہاں سے وہ پائپ لائن گذرتی ہے جو کویت کے شمالی تیل کے کنوؤں سے موجودہ بڑے آئل ٹرمینل احمدی تک آتی ہے۔ کاظمہ کے قریب ہی جنوب مغرب میں جہرہ کا چھوٹا سا شہر ہے جہاں سے بصرہ کو سیدھی سڑک جاتی ہے۔ کاظمہ اب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

[1] کاظمہ کا نام جاہلی اور اسلامی عہد کے عربی اشعار میں بھی ملتا ہے۔

بصرہ سے حج کا راستہ اسی کاظمہ سے ہو کر گذرتا تھا کہ صرف وہاں اس ریگستانی علاقہ میں وافر پانی موجود تھا، موجودہ شہر کویت سے صرف بیس پچیس کیلو میٹر کے قریب ہے۔ اب کاظمہ کے بجائے جہرہ کو اہمیت حاصل ہے اور یہ کویت شہر سے صرف ۱۵ میل دُور ہے۔

یہ تو تفصیل سے واضح ہو گیا کہ موجودہ کویت وہیں آباد ہے جس کے قریب پہلے "کاظمہ" آباد تھا۔ جہاں تک اس کے عراق یا جزیرۂ عرب سے تعلق کا تعلق ہے تو قدیم جغرافیائی کتابوں میں جزیرۂ عرب کے مشرقی ساحل کا علاقہ کہا گیا ہے، جس کو قدیم اسلامی زمانہ میں "بحرین" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور یہ موجودہ ابوظہبی و دبئی وغیرہ ساحلی علاقوں سے عراق کی حدود تک واقع تھا۔ موجودہ جزیرۂ بحرین کا نام اس قدیم زمانہ میں "اوال" تھا اور یہ بھی اس قدیمی بحرین یا سعودی عرب کے مشرقی ساحل کا ایک حصہ تھا اور اب قدیمی نام کا اطلاق صرف اس جزیرہ پر ہوتا ہے۔ یہ سعودی ساحل سے اس قدر قریب ہے کہ الخبر سے نظر آتا ہے اور اب اس سعودی ساحلی شہر سے بحرین کو ایک سمندری سڑک جاتی ہے جس کی تکمیل صرف ۴ سال قبل ہوئی ہے۔

اس جغرافیائی حقیقت کے پیش نظر درحقیقت یہ موجودہ سعودی عرب کا علاقہ ہے اور اس پر عراق کا دعویٰ صحیح نہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کویت سعودی عرب کے کسی شہر کے مقابلہ میں عراقی حدود اور اس کے مشہور پورٹ بصرہ سے قریب تر ہے ایسا ہی جیسے آپ کراچی سے حیدرآباد چلے جائیں۔

جہاں تک صدام حسین کے اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ یہ سیاسی طور پر عراق کا ایک حصہ ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی میں جس وقت نجد میں ایک مستقل حکومت قائم تھی اُس وقت کویت بصرہ کے ترکی گورنر کے ماتحت تھا، تا آنکہ اس پر انگریزوں نے ۱۸۹۹ء میں قبضہ جما لیا۔ اور پھر کویت بمبئی کے گورنر کے ماتحت تھا، اور یہاں ایک پولیٹیکل ایجنٹ (انگریز) رہتا تھا۔

علاوہ ازیں امین الریحانی نے اپنی مذکورہ سابق کتاب ملوک العرب ص ۶۷۹ میں

۱۹۲۲ء میں دلچسپ انداز میں انکشاف کیا تھا کہ کویت اس وقت دو غالب قوموں اور دو طاقتوں اور اس پر قبضہ کی لالچ رکھنے والی دو حکومتوں یعنی نجد و عراق کے درمیان اس طرح ہے جیسے ایک حسینہ دو عاشقوں کے درمیان، کہ دونوں اس کے طالب ہیں۔ اس کے بعد اس نے یہ بھی مزید انکشاف کیا ہے کہ بغداد میں مجھے ایک ذمہ دار سرکاری شخص نے کہا کہ "کویت عراق کا ایک حصہ ہے"، اور کویتی عراق کے ساتھ انضمام پسند کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کویت پر عراق کی نظریں ۲۳-۱۹۲۲ء سے رہی ہیں اور عراق کو کھلے سمندر میں اپنے لیے ایک پورٹ کی سخت ضرورت ہے کہ بصرہ شط العرب (دریا) پر واقع ہے۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عراق اور نجد کے قبائل اس صدی کے اوائل میں کویت پر حملے کرتے رہے ہیں۔ مگر کویت کے حکام نے ہوشیاری سے اپنی آزادی کو برقرار رکھا اور ابن سعود (موجودہ شاہ فہد کے والد عبدالعزیز) سے تعلقات استوار رکھے۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب کویت میں تیل کی دریافت نہیں ہوئی تھی اور کویت کی آمدنی کا ذریعہ سمندری تجارت، ماہی گیری اور سمندر سے موتی نکالنا تھا اور یہ سب کویت کے مشرقی ساحل پر تھا۔ جہاں زیادہ تر گھر مٹی کے تھے۔ کویت کا نوے فی صد علاقہ شمال، جنوب اور مغرب میں بے آب و گیاہ ریگستان ہے اور وہاں خال خال ہی کہیں آبادی ہے۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں وہاں تیل کی دریافت سے اس سارے صحرائی علاقہ کی اہمیت انتہائی بڑھ گئی ہے۔ تیل شمال، جنوب، مشرق ہر طرف کے علاقوں میں پایا گیا۔ اس درمیان میں دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ اور انگریزوں نے جرمنوں کے ڈر سے جن کی نگاہیں شرق اوسط پر تھیں اور جہاں پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے انگریزوں سے نفرت و بیزاری عام تھی۔ ۱۹۴۲ء میں دریافت شدہ دس بارہ تیل کے کنوؤں کو کنکریٹ سے بند کر دیا۔ اور ۱۹۴۶ء میں دوبارہ یہ کنویں کھولے گئے۔ اور ان سے تیل نکالنا شروع کیا گیا اور پھر مزید کنویں عراق کی سرحد پر واقع مناطق سے

لے کر جنوب میں سعودی سرحد تک دریافت ہوئے اور معلوم ہوا کہ کویت ایک ایسے جہاز کی طرح ہے جو پانی کے بجائے تیل پر کھڑا ہے۔

شیخ احمد الشرباصی مصری لکھتے ہیں کہ کویتی لوگ کہتے ہیں کہ ۱۹۵۲ء میں ہم پانی کے لیے زمین میں کنواں کھودتے ہیں تو کھاری پانی نکلتا ہے، مزید کھودتے ہیں تو تیل نکل آتا ہے۔ سو اب کویت کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے، کویتی برٹش آئل کمپنی تیل کی صنعت پر قابض تھی جس نے آئیل ٹرمینل "الاحمدی" میں ایک مستقل انگریز کالونی بنا رکھی ہے۔ (میں نے اس کالونی کو ۱۹۶۴ء میں دیکھا تھا)۔

عراق میں ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کے بعد نوجوان بادشاہ فیصل بن غازی بن الملک فیصل (شاہ حسین کے چچا زاد بھائی) کی حکومت ختم کر دی گئی تھی اور جنرل عبدالکریم قاسم حکمران تھا۔ جیسے ہی کویت کو ۱۹۶۱ء میں آزادی ملی یہ اپنے ٹینک لے کر کویت کی سرحد پر آ گیا۔ انگریز جلد ہی مشترکہ فوجی معاہدہ کے تحت وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے عبدالکریم قاسم کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے ٹینک وہاں سے واپس لے جائے اس طرح کویت انگریزوں کی مدد سے عراق سے بچا۔ یہاں انگریزوں کے اپنے تیل سے متعلق اہم مفادات بھی تھے۔

اس بار ۲ راگست ۱۹۹۰ء کو دوسری بار آناً فاناً ایک بھاری فوج اور ٹینکوں کی مدد سے عراق کویت پر ایک رات ہی میں قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا اور عراقیوں کی کویت پر قبضہ جمانے کی نصف کی صدی کی خواہش پوری ہوئی۔ لیکن اب ۱۹۶۱ء کے حالات نہیں ہیں۔ امریکہ اور روس کی سرد جنگ ختم ہو گئی ہے۔ افغانستان میں شکست کے بعد روس اپنی داخلی سیاسی و اقتصادی مشاکل میں گھرا ہوا ہے اور امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور یا طاقت عظمیٰ ہے۔ اس کو گوارا نہیں کہ عراق اپنی زبردست فوجی قوت کے ساتھ کویت پر قابض رہے اور خلیج میں اس کا نفوذ قائم ہو جس کی تیل کی دولت سے امریکہ و یورپ کی صنعتیں چلتی ہیں۔ اس لیے وہ اپنی اور اپنے مغربی حلیفوں خاص طور پر پرانے استعماری ملک برطانیہ و فرانس کی زبردست فوجی طاقت کے ساتھ

خلیج میں آدھمکا اور عراق کے خلاف وہ ہولناک اور تباہ کُن جنگ شروع کی جس کے مناظر صبح و شام ہم امریکی ٹیلی وژن سی این این پر دیکھ رہے ہیں۔

انتہائی افسوس ناک بات یہ ہے کہ مسلمان بلکہ عرب ملک اس میں دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں، جب کہ ان کو صلیبی، یہودی، امریکی اور یورپی طاقتوں کے ناپاک عزائم کو سمجھ کر ان کے خلاف متحد ہونا چاہیے تھا۔

سعودی عرب اور کویت یا بالفاظِ دیگر سعودی اور کویتی حکمرانوں کا باہمی تعلق بھی اس نزاع اور فوجی کارروائی میں ان کا باہمی اشتراک بھی اپنے اندر ایک تاریخی پہلو رکھتا ہے جو باختصار یہ ہے۔

کویت کا حکمران خاندان الصباح اسی قبیلہ عنزہ سے تعلق رکھتا ہے، جس سے آل سعود ہیں۔ اور یہ کویت میں آئے بھی نجد سے تھے۔ ۱۸۹۱ء میں شاہ فہد کے دادا عبدالرحمٰن بن فیصل آل سعود نے نجد کے شمال میں حائل ریاست کے حکمران یعنی آل رشید کے ہاتھوں شکست کھا کر کویت میں بھاگ کر پناہ لی تھی۔ اس وقت شاہ فہد کے والد الملک عبدالعزیز آل سعود کی عمر پندرہ سال تھی۔ گیارہ سال تک جلاوطنی میں یہ اپنے والد سابق سلطان نجد عبدالرحمٰن آل سعود کے ساتھ شیخ یا حاکم کویت مبارک الصباح کے مہمان رہے اور یہیں پل کر جوان ہوئے۔

پھر انہوں نے مبارک الصباح کی مختصر مالی و عسکری مدد سے ۱۹۰۲ء میں ایک مہم جویانہ اچانک حملہ رات کے اندھیرے میں کر کے ریاض کے غاصب حاکم کو قتل کر دیا اور ریاض پر قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح دوبارہ آل سعود کی حکومت ریاض و نجد میں قائم ہو گئی اور آس پاس کے چھوٹے بڑے آزاد علاقوں اور آخر میں حجاز پر قبضہ کر کے الملک عبدالعزیز نے وہ مضبوط مملکت قائم کی جس کو آج ہم سعودی عرب کے نام سے جانتے ہیں۔

رسائل و مسائل

اسلامی عدالت سے تفریقِ نکاح

سوال:۔ گذارش خدمت ہے کہ ہمارے علاقہ آزاد کشمیر میں ایک شرعی مسئلہ درپیش ہے۔ جس کے بارے میں تفصیل حسب ذیل ہے:

ایک لڑکی کی شادی ہوئی جو عرصہ ایک سال تک اپنے گھر میں بستی رہی۔ مگر اس کے بعد میاں بیوی میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ جس کے بعد خاوند کا رویہ بیوی کے ساتھ اچھا نہ رہا۔ خاوند کی زیادتی کی وجہ سے وہ لڑکی اپنے والدین کے پاس چلی گئی۔ لڑکی کو والدین کے ساتھ رہتے ہوئے جب تین سال کا عرصہ ہوا تو خاوند بیرونِ ملک چلا گیا۔ اس کے بعد لڑکی نے عدالت سے قانونِ خداوندی کے تحت طلاق کی استدعا کی۔ کیس عدالت میں چلتا رہا۔ مختصر یہ کہ اس کیس کا فیصلہ لڑکی کے حق میں ہو گیا۔ یعنی عدالت نے لڑکی کو فسخِ نکاح کی ڈگری دے دی۔ اور دوسری جگہ نکاح کا اختیار دے دیا۔ تو عدالتی طلاق کے گیارہ دن بعد اس لڑکی نے دوسری جگہ نکاح کر لیا۔

اب آپ دینِ اسلام کی روشنی میں اس سوال کا جواب دیجیے کہ کیا اس لڑکی کا نکاحِ ثانی ہو گیا ہے۔ اگر نکاح نہیں ہوا تو دینِ اسلام کی روشنی میں فتویٰ صادر فرمائیں۔

جواب:۔ آزاد کشمیر کی حکومت کے مسلمان جج نے زوجین کے جس نکاح کی تفریق کا فیصلہ صادر کر دیا۔ اور اس فیصلے کو کسی بالاتر عدالت مرافعہ نے اپیل کے ذریعے سے

منسوخ یا تبدیل نہیں کیا تو ازالۂ نکاح کا یہ فیصلہ طلاق بائن کا قائم مقام ہے۔ لیکن مطلقہ عورت جس کے حق میں فیصلہ ہوا ہے، اس پر لازم و واجب تھا کہ جب تک تاریخ فیصلہ کے بعد عدت (تین ایام ماہواری) نہ گذار لے، اُس وقت تک نکاح ثانی نہ کرتی۔ لہٰذا فیصلہ کے گیارہ دن بعد ہی اُس نے جو دوسرا نکاح کر لیا وہ فاسد و ناجائز ہے۔ فریقین نکاح ثانی پر شرعاً واجب ہے کہ وہ فوراً ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں اور اپنے گناہ پر صدقِ دل سے تائب ہو کر اللہ تعالیٰ سے عفو و درگذر کے طلب گار ہوں۔ عدت گذر جانے کے بعد اگر دونوں چاہیں تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ عدت گذرنے سے پہلے جنہوں نے نکاح خوانی کی یا مجلس میں شمولیت کی وہ بھی گناہ کے مرتکب ہوئے۔ انہیں بھی توبہ و استغفار کرنا اور اللہ سے معافی مانگنا چاہیے۔ نکاح سے پہلے علماء سے رجوع لازم تھا۔ اب توبہ و تلافی کر لی جائے۔

(ملک غلام علی)

(بقیہ افواہیں اور ان کے مہلک اثرات)

بجا شائع کرنا چاہیے۔ اور ان ہی چیزوں کو شائع کرنا چاہیے، جن کی اشاعت واقعی ضروری ہو اور ان کی اشاعت سے منفی اثرات معاشرہ میں نہ پیدا ہوتے ہوں۔

اگر ہمارے اخبارات اِن آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ کی روشنی میں ایک ضابطۂ اخلاق و عمل طے کر لیں تو یقیناً مثبت اور صحت مند صحافت بھی افواہ سازی کے خلاف اپنا کردار ادا کر سکے گی۔

مطبوعات

اسلامی ریاست میں علاقائی حقوق کا تصور	از پروفیسر عبدالخالق شہریانی بلوچ

(چہار گانہ ایم اے)۔ ناشر: مکتبۂ اصلاحِ ملت کندھ کوٹ - لاہور میں ملنے کا پتہ: البدر پبلی کیشنز - راحت مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور- صاف ستھری جدید کمپیوٹری طباعت، سفید کاغذ- دبیز آرٹ کارڈ کا رنگین سرورق- صفحات: ۱۲۸
قیمت: ۳۰/ روپے۔

پروفیسر عبدالخالق شہریانی بلوچ نے "ایک نئے موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب" (ص - ۱۰) "۸ سالہ تحقیق و مطالعہ" (ص ۱۴) اور بہت سے علماء و مفکرین سے مشورے لے کر (ص ۴) پیش کی ہے۔ صوبوں کی تقسیم، اراضی، آبپاشی، ملازمتیں ایسے ہی مسائل پر جو انتشارِ فکر پایا جاتا ہے۔ اسے حل کرنے کے لیے پروفیسر صاحب نے قرآن، حدیث، قرونِ اُولیٰ کے تصورات اور صحابہ اور بعد کے اجتماعی نقطہائے نظر سے استفادہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلامی ریاست میں نہ صرف علاقائی، بلکہ دائرۂ اسلام کے تحت جمع ہونے والی مختلف اقوام اور قبائل کے لیے واضح طور پر بعض استحقاقات معین کیے ہیں۔ اس سلسلے میں مسئلے کو ایک عالم و مفکر کے اس قول سے خوب نکھار دیا گیا ہے کہ "اس نظام میں قومی محبت کے لیے جگہ ہے۔ مگر قومی تعصب کے لیے جگہ نہیں۔ قومی خیر خواہی جائز ہے، مگر قومی خود غرضی حرام ہے" (ص ۳۰)

مجھے یہ کتاب اس لیے پسند آئی کہ اس کا مزاج انحراف پسندانہ نہیں، بلکہ محبت اسلام پر مبنی ہے۔ اس میں سطحی اور صحافیانہ انداز کے طعنے اور کوسنے، مذہبی عناصر کو دینے کے

فیشن سے اجتناب کر کے غیر جذباتی انداز میں صحیح اسلامی مآخذ کو سرمایۂ تحقیق بنایا گیا ہے اور متعدد ذمہ دار علما و مفکرینِ دین سے مشورہ لینے کے علاوہ ان کی کتابوں سے تائیدی دلائل جمع کیے گئے ہیں۔ جبھی تو مولانا احمد طاسین مدظلہ صدر مجلسِ علمی دکن نظریاتی کو تسلیم کہنے پر مجبور ہوئے کہ "میں بھی متفق ہوں" (ص ۱۰)۔ میں نے حوالے اور ان سے اخذ کردہ نتائج کو پڑھا مگر کہیں ہیر پھیر کے طریقِ بیان کی جھلک نہیں دیکھی۔

مقدمہ پڑھ کر یہ تشنگی محسوس ہوئی کہ فرزند زمین (SON OF THE SOIL) کے نظریۂ فاسد کی کوئی تجزیہ کاری نہیں کی گئی۔ یہ مغرب کے تصورِ وطن پرستی کا لازمی نتیجہ ہے کہ جو ایک ہی ملک کے کسی علاقے کی قدیمی نسل سے نہیں رہے اس کو وہاں رہنے کا حق نہیں۔ اس نظریے کے تحت بھارت کے کروڑوں مسلمان، روہنگیا مسلمان (اراکان برما) اور خود پاکستان کے بعض علاقوں میں پاکستانیوں کے لیے جگہ نہیں۔ دوسرا سوال یہ حل نہیں کیا گیا کہ مہاجرت کر کے آنے والے تہی دست لوگوں کے لیے ہمارے پاس کس سرزمین میں کیا مقام ہے؟ تیسرے یہ کہ اگر ایک صوبہ میں ناکارہ پڑی زمینوں کو اپنی مہارت و محنت سے دس سال لگا کر دوسرے صوبے کے لوگ باغ و بہار بنا دیتے ہیں تو ان کا بدلہ یہ نہیں کہ ان کو کلاشنکوف دکھا کر، قتل کی دھمکیاں دے کر، ان کی فصلوں کو آگ لگا کر، اُن کے مویشیوں کو بھگا کر، ان کے سامان لوٹ کر اور ان کی بیٹیوں کو قبضے میں کر کے ان کو خالی ہاتھ دھکیل دیا جائے۔ وہ تو ویران زمین کو سونا اگلنے پر مجبور کرنے والے ماہرین تھے، جن کو بہت اچھا معاوضہ دے کر رخصت کیا جانا چاہیے تھا۔ اسی طرح یونیورسٹیوں میں جو اُستاد اور علما پڑھانے کے لیے باہر سے طلب کیے گئے۔ یا جن طلبہ کو داخلہ ملا، ان کو قتل و غارت گری کا نشانہ بنایا گیا۔ یعنی ہر جگہ جرائم پیشہ لوگ قانون ہاتھ میں لے کر انسانیت کے تقاضوں کو پامال کرتے ہیں اور یہ سب مُسلم بھی کہلاتے ہیں۔

ہم پروفیسر صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ سیاسی و معاشرتی و معاشی ماحول کو موجودہ گندی صورت میں برقرار رکھ کر اگر صرف اس ایک "علاقائی حقوق" کے

معاملے میں اسلامی استدلال جمع کر دیا جائے تو اس سے کیا حاصل ہوگا جب کہ بالفاظ پروفیسر اسد اللہ بھٹو، باقی تمام معاملات میں لوگوں نے (اور حکومت نے) "اپنے آپ کو اسلام کے حوالے نہ کیا؟" اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ پورا ملک اور پوری ریاست اور قوم اپنے تمام شعبہ ہائے زندگی کو اسلام کے حوالے کر کے وہ ماحول پیدا کرے جس کی تصویر آپ نے کتاب و سنت کے حوالوں اور قرونِ اولیٰ کی مثالوں اور علما کی تحقیقات سے کھینچی ہے۔ یہ بڑا کام اگر نہ ہو تو پھر آپ گندے تالاب میں کنول اگانے کی ضرور کوشش کریں، مگر تالاب کا پانی نہ تو مفید صحت بن سکتا ہے اور نہ پاک۔

یعنی یہاں قضیہ ایک جزیہ میں اسلام سے انحراف کا نہیں، بلکہ عملاً کلی انحراف کا ہے۔ (چند افراد یا مختصر آدمیوں کے استثنیٰ کے ساتھ۔) لہٰذا اصل زور اساسی اور کلی اصلاح و تعمیر پر دینا چاہیے۔ ہر جزئیہ خود بخود درست ہوتا جائے گا۔

فکر و نظر از جناب پروفیسر اسرار احمد سہاوری۔ ایم اے ایل ایل بی)۔
ناشر: فروغ اکادمی ۱۰۸، بی سٹیلائٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ۔ سفید کاغذ پر اچھی کتابت و طباعت۔ ۱۶۰ صفحات۔ مجلد مع سرورق۔ قیمت: ۸۰/- روپے۔

پروفیسر صاحب کی قابلیتوں کا تذکرہ کیے بغیر، مجھے یہ کہنا ہے کہ پہلے ان سے تعلق خاطر محض ہم قلمی و ہم قدمی کا تھا۔ بعد میں ایک طرف میرے لیے ان کی شفقتوں میں تیزی سے اضافہ ہوتا گیا۔ اور دوسری طرف وہ استادانہ اور مفکرانہ مقام کی بلندیوں کو طے کرتے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ اب ان کی کتاب سے استفادہ تو خیر، اس کے تنقیدی تجزیہ کرنے کی جرأت کہاں باقی ہے۔

محض تعارف کے لیے عرض کرتا ہوں کہ یہ کتاب ان کے ۱۱ علمی و ادبی مقالات کا مجموعہ ہے:۔ ۱۔ قرآن کا نظریۂ ادب ۲۔ مولانا ماہر القادری ۳۔ فلسفۂ انقلاب ۴۔ آداب مراسلہ نگاری ۵۔ موجودہ ادبی رجحانات ۶۔ اصغر گونڈوی خدا کے حضور

۷۔ پاکستانی ادب ۸۔ پاکستان کا غیر نظریاتی ادب ۹۔ جدید علامت نگاری ۱۰۔ حصول مسرت ۱۱۔ مولانا مودودی کا طرز نگارش۔

اِن عنوانات کو جو اہمیت خدا پرستانہ ذہن کے نگارندوں کی نگاہ میں حاصل ہے اسی سے پروفیسر اسرار صاحب کی تگ وتازِ فکر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پسند اپنی اپنی ہوتی ہے۔ مجھے مولانا ماہر القادری، موجودہ ادبی رجحانات، اصغر گونڈوی خدا کے حضور میں، پاکستانی ادب، جدید علامت نگاری، حصول مسرت، مولانا مودودیؒ کا طرزِ نگارش زیادہ پرکشش تحریریں محسوس ہوئیں۔

صرف ایک بات، ہزار درجے پاس ادب و محبت کے ساتھ! "قرآن کا نظریۂ ادب" میں خصوصاً اور بعض دوسری جگہ نظریاتی بحثوں میں کہیں کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ادب کی بات کو ادبی اصطلاحات، چاہے خدا پرستانہ ادبی فکر کو بیان کرنے کے لئے بالکل نئی اصطلاحات اور اندازِ بیان وضع کرنا پڑے۔ مذہبی رنگ میں اور مذہب کے حوالے سے نہیں لانا چاہیئے بلکہ مذہب کے بھی اونچے جامع تہذیبی تصور اور انسانی فلاح و بہبود کے ایک بڑے سسٹم (جس کے اندر مذہب بھی شامل ہے) کو لے کر چلنا درست ہوگا۔ اس کے لئے بہت سے دوست مختلف اطراف سے کوششیں کر رہے ہیں۔ آگے چل کر اس کا معیار بن جائے گا۔

ایک جگہ "مافوق" کا استعمال دیکھا۔ دو تین مرتبہ یہ لفظ آیا ہے (ص ۱۵) اس کا مفہوم دو چیزوں کے تقابل کے لئے نہیں ہوتا کہ فلاں چیز فلاں چیز سے بالاتر ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص شے یا نقشہ یا واقعہ یا منظر یا قانون کے ساتھ جب مافوق کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ جو جو کچھ بھی "اس" سے بالاتر ہے۔ لفظ "ما" پر توجہ درکار ہے۔ آپ نے جہاں اسے استعمال کیا ہے وہاں برتر یا بالاتر یا بلند تر جیسے الفاظ استعمال ہونے چاہئیں۔ یہ "ماتحت" کی مانند نہیں ہے۔ ماتحت کے معنی اردو میں بالکل بدل گئے ہیں۔ عام سی بات ہے۔ فلاں فلاں کے ماتحت ہے۔

مضامین میں اشعار کا انتخاب مطالعہ کی وسعت کا گواہ ہے۔

عشرہ مبشرہ تالیف: بشیر ساجد۔ ناشر: البدر پبلیکیشنز۔ راحت مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۴۶۸ خوبصورت جلد۔ عمدہ سفید کاغذ۔ طباعت و کتابت گوارا (کمپوٹر)۔ قیمت: ۱۶۰/- روپے مناسب۔

یہ کتاب محترم بشیر ساجد صاحب نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے مرتب کی ہے۔ عشرہ مبشرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے رُوح پرور حالات وواقعات پر مشتمل ہے۔ عشرہ مبشرہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے وہ مبارک ہستیاں ہیں، جنہیں ان کی زندگی میں ہی جنت کی بشارت دے دی گئی۔ اور یہ ایک ایسی سعادت ہے جو پوری دُنیا کے انسانوں میں صرف ان ہی خوش بختوں کے حصے میں آئی۔

یہ وہ شخصیات ہیں جو ایک ایسے اسلامی انقلاب کی داعی بن کر اُٹھیں جنہوں نے انسانی تہذیب و تمدن کو نیا معیار عطا کیا اور یہ وہ عظیم الشان انسان تھے جن کی مثال ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی۔

عشرہ مبشرہ ایک ایسی کتاب ہے جس سے ہم علمی اور فکری رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ مؤلف نے طویل تگر احساسات سے معمور "حرف اوّل" میں اسلام کے "خیر القرون" کے حالات و شخصیات سے عمومی بے خبری پر شدید تاسف کا اظہار کیا ہے۔ وہ بڑے دُکھ سے لکھتے ہیں کہ ہم اپنے شاندار ماضی اور اسلامی تاریخ سے منہ موڑ کر اپنی تاریخ، تہذیب، اور ثقافت ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے کھنڈرات میں تلاش کر رہے ہیں اور نئی نسل کو کعبہ کی بجائے ترکستان کی راہ پر چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

عشرہ مبشرہ اسلام کے عظیم المرتبت دس صحابہ کرام کے حالات وواقعاتِ زندگی پہ ایک مبسوط کتاب ہے۔ اس کے باوجود کتاب میں کمپوٹر کی غلطیاں جا بجا کھٹکتی ہیں اکثر مقامات پر قرآنی آیات تک میں کتابت اور اعراب کی فاحش اغلاط ہیں۔ اسی طرح احادیثِ مبارکہ میں بھی صحت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ علاوہ ازیں کتاب کے آخر میں حوالہ جات کی فہرست (کتابیات) کے اندراج کی زحمت بھی گوارا نہیں کی گئی، حالانکہ اس پایہ کی کتاب کے لیے یہ ایک ضروری امر تھا۔ (سید شبیر احمد)

چراغ جلتے رہے | مصنف: صبا حسنی ۔ ناشر: ادارۂ معارف اسلامی، منصورہ لاہور

صفحات: ۱۵۰ سائز: ۱۸×۲۲/۱۶ غیر مجلد۔ قیمت: ۳۰/- روپے

کچھ اہل ہمت چپکے سے کوئی چونکا دینے والا کام کر گذرتے ہیں۔ اس کتاب کے مصنف جناب صبا حسنی نے بھی یہ کتاب پیش کر کے ایک ایسا ہی کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ ان کی ۱۸ ایسی طویل نظموں پر مشتمل ہے جس میں تاریخِ اسلام کے بہت اہم واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

ان کی شاعری کا فکری پس منظر یہ ہے کہ غیر مسلم قوموں کی مادی ترقی حقیقی ترقی نہیں ہے۔ حقیقی ترقی وہ تھی جب نسلِ انسانی نے انصاف اور بے انصافی کے فرق کو سمجھا تھا اور مظاہر پرستی اور توہم پرستی کی تاریکیوں سے نکل کر خدا پرستی اور علم و ایقان کی روشن فضا میں سفر شروع کیا تھا۔ اس زمانے میں آسمانِ زندگی پر عظیم انسانوں کی صورت میں ان گنت تابناک ستارے طلوع ہوئے تھے۔

جناب صبا حسنی نے ایسی ہی عظیم شخصیتوں کے حوالے سے تاریخِ اسلام کے بہت اہم واقعات نظم کیے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کام بہت خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ طویل نظموں میں شعر کا حسن بہت مشکل سے باقی رہتا ہے، لیکن "چراغ جلتے رہے" کے شاعر نے شاعری کا حسن برقرار رکھا ہے۔ مضامین کے ربط کے اعتبار سے ان نظموں کی حیثیت مثنوی کی ہے، لیکن بحر مثنوی کی نہیں۔ یہ ہیئت کی بات ہے لیکن شعر کے اثر اور پاکیزہ مضامین کے اعتبار سے کوئی ادنیٰ کمزوری بھی نہیں۔ یہ کتاب ہر لحاظ سے ایسی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔ اور نوجوانوں کو اس کے مطالعے کی ترغیب دی جائے۔ (نظر زیدی)

REGD. NO L 5340

PHONE : 234014
236665

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE

تزئینِ نو کے بعد
پہلا شمارہ

ماہ جنوری ۱۹۹۴

سے منظرِ عام پر آرہا ہے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

کا ۱۹۳۲ میں جاری کردہ ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر مسئول: خرّم مراد

اُمّت و انسانیت کے مُستقبل کا رہنما رسالہ

اَب مُستقبل اسلام کا ہے!

- اسلامی زندگی کی تشکیلِ نو • مغرب کا تہذیبی و سیاسی تسلّط • تزکیۂ نفس و اجتماع
- عالمِ اسلام، احیائے اسلام اور اسلامی تحریکات • پاکستان کے قومی مسائل

آپ کے ذہنوں میں سلگتے سوال — ہمارے جواب

نیوز پرنٹ کی بجائے
سفید کاغذ
صفحات
۵۶ سے بڑھ کر ۸۸

قیمت فی شمارہ
۱۰ روپے
سالانہ چندہ
۱۰۰ روپے
بذریعہ ہوائی ڈاک: یورپ امریکہ — ۲۵ ڈالر
دیگر ممالک — ۲۰ ڈالر

آج ہی
اپنے ایجنٹ کو آرڈر دیں
یا
سالانہ خریدار
بن جائیں۔

ایجنٹ حضرات ۱۵ دسمبر ۱۹۹۳ تک آرڈر بک کروائیں

اِدارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ
اردو بازار لاہور۔ فون نمبر: ۷۲۳۴۰۱۴-۷۲۳۶۶۶۵/منصورہ ۸ ... ۵۴۰۱۲۴